کاغذی لشکر کا سپاہی

افسانوی مجموعہ



ناصر ضمیر

کاغذی لشکر کا سپاہی

افسانوی مجموعہ

ناصر ضمیر

نام کتاب ______ کاغذی لشکر کا سپاہی

مصنف ______ ناصر ضمیر

سن اشاعت ______ 2021ء

تعداد ______ 500

قیمت ______ **300/=** روپے

کمپیوٹر کمپوزنگ ______ شوکت عباس

سرورق ______ ایس۔طارق

ناشر ______ میزان پبلشرز بٹہ مالو سرینگر

☆☆☆

ملنے کا پتہ

ناصر ضمیر

بب جانس ہاؤس

جلال آباد سوپور ضلع بارہمولہ۔193201

فون: **9419031183**

7780889616

nasirzameer77@gmail.com

انتساب

اپنے والد مرحوم محمد امین تو گو صاحب کے نام
جن کی نصیحتیں میرے لیے مشعلِ راہ ہیں

اور

اپنی والدہ ماجدہ حبلہ بیگم کے نام
جن کی دعاؤں کا سایہ ہمیشہ میرے ساتھ ساتھ ہے

ناصر ضمیر

اس شہر میں اب سعادت شاہی کی علامت
دربان کا عصا ہے کہ مصنف کا قلم ہے

فہرست

☆☆☆

پیش لفظ

ایک دن اور.....!

ناصر ضمیر کی پہلی ادبی کاوش..... پہلی افسانوی تخلیق!!

اور یہ تخلیق مرحوم ابن اسماعیل کے معروف و مقبول جریدہ بزمِ ادب (شمارہ نمبر۲۔جنوری تا مارچ ۲۰۰۸ء) میں شائع ہوئی۔ بزمِ ادب کے تعلق سے یہ کہنا مناسب ہوگا کہ فکر انگیز اور دانش افروز تحریروں پر مشتمل یہ ایک ایسا جریدہ تھا جو اشاعت کے چند برسوں میں اپنی ایک اہم دستاویزی حیثیت بنا کر ابن اسماعیل کی وفات کے ساتھ ہی اشاعت کی پابندیوں سے آزاد ہوگیا اور اس طرح قارئین اردو ایک بہتر اور معیاری رسالے کے مطالعہ سے محروم ہوگئے۔ بزمِ ادب کا ہر شمارہ مستند و ممتاز قلم کاروں کی معیاری و معلوماتی،تعلیمی،علمی اور ادبی نگارشات کو سلیقہ مندی سے سجا کر منظر عام پر لاتا تھا اور اسی پس منظر میں ناصر ضمیر کی پہلی کہانی ___ ایک دن اور ___ اسی باوقار جریدہ کی زینت بنی اور ان کے ادبی سفر کا آغاز ہوا۔ اس کہانی کی اشاعت کے ساتھ ہی ناصر ضمیر کا نام ادبی حلقوں میں گردش کرنے لگا۔ بزمِ ادب کے اسی شمارہ میں مرحوم عمر مجید کی مقبول کہانی ''شہر کا اغوا'' بھی شائع ہوئی تھی۔ میرے ذہن کے خاموش گوشوں سے دو ایک باتیں ابھر رہی ہیں۔ناصر ضمیر کی کہانی کی اشاعت کے چند روز بعد کینی ہاؤس میں گرم گرم چائے سے اپنے نرم نرم

ہونٹوں کوتر کرتے ہوئے مرحوم عمر مجید کہنے لگے ___ ''مجھے لگتا ہے کہ ناصر ضمیر کی آمد سے کشمیر کی افسانوی دنیا کو ایک نئی قوت ملے گی بشرطیکہ وہ محنت، لگن اور جذبۂ خلوص کو اپنی سوچوں کا حصہ بنائیں اور خوب مطالعہ کرنے کی عادت کو اپنانے سے گریز نہیں کریں گے'' ___ ایک ادبی محفل میں کشمیر کے نئی نسل کے افسانہ نگاروں کی بات ہو رہی تھی تو محترمہ رخسانہ جبین صاحبہ نے میری جانب دیکھتے ہوئے اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں کہا کہ افسانہ نگاروں کی اس فہرست میں ایک اور نام کی گنجائش نکل آئی ہے۔ تھوڑی سی خاموشی اختیار کرنے کے بعد انہوں نے ناصر ضمیر کا نام لیا اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ (مرحوم) ابن اسماعیل نے بزمِ ادب میں ناصر ضمیر کے افسانے شامل کر کے ان کی ادبی ذمہ داریوں میں اضافہ کیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ناصر ضمیر اپنی ذمہ داریوں کو نبھانے کے لیے کس حد تک اپنے قلم کو اپنا ساتھی بنا لیتے ہیں''۔

یہاں ایک اور بات کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ افسانوی دنیا کو اپنانے سے پہلے ناصر ضمیر شعر بھی کہتے تھے لیکن بعد میں شعر گوئی سے اپنا ناطہ توڑ دیا۔

۱۔ کچھ اشکوں نے لکھا ورنہ
کورا کاغذ کورا رہتا

۲۔ ایسے کیوں جدا سے ہو
لگتا ہے خفا سے ہو

۳۔ اپنا گزارا آبادیوں میں نہیں
نام اپنے سبھی ویرانے لکھوں

ناصرضمیر کی کہانیاں بزمِ ادب میں شائع ہوتی رہیں اور مقامی سطح پر ان کی پذیرائی بھی ہوتی رہی ۔ناصرضمیر کی تحریر کردہ کہانیاں اُن کی پہچان بنانے میں ایک خاص کردار ادا کرنے لگیں۔اردو حلقے ناصرضمیر کے نام سے آشنا ہونے لگے۔اُن کے احباب کا حلقہ بڑھتا گیا۔وہ ادبی محفلوں میں بھی نظر آنے لگے۔چند کہانیاں جو بزمِ ادب میں شائع ہوئیں اوراب تک میرے ذہن میں محفوظ ہیں کچھ اس طرح سے ہیں۔''واپسی''،''رمق''،''زوال کی دستک'' اوربھی کہانیاں ہوسکتی ہیں جو مجھے یاد نہیں۔بہرحال ناصرضمیر کوافسانوی دنیا میں متعارف کرانے میں بزمِ ادب کا ایک بڑا ہاتھ رہا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ناصرضمیر کے اندر پوشیدہ افسانہ نگار کوتلاش کرنے میں مرحوم ابن اسماعیل کی نگاہ کونظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔

اس کے بعد ناصرضمیر کے ادبی سفر کا دوسرا پڑاؤ شروع ہوتا ہے اوراس پڑاؤ میں کشمیرعظمیٰ کا ادب نامہ بڑی اہمیت اورافادیت کا حامل ہے۔میں تو سمجھتا ہوں کہ جاوید آذر صاحب ناصرضمیر کے اندر چھپے ہوئے افسانہ نگار کو دیکھ چکے تھے اور انہوں نے افسانہ نگار کی ادبی صلاحیتوں کونکھارنے اورسنوارنے میں ایک بڑا کردار نبھایا۔اتنے برس بیت جانے اور ناصرضمیر کوادبی سطح پر افسانہ نگار کی حیثیت میں تسلیم کرنے کے باوجود کشمیرعظمیٰ سے ان کی ادب دوستی قائم ودائم ہے وہ آج کل اکثر ادب نامہ میں نظر آتے ہیں۔جاوید آذر صاحب کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ جب بھی کسی قلم کار کی قلمی صلاحیتوں سے آشنا ہوتے ہیں تو ادبی پلیٹ فارم فراہم کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ کشمیرعظمیٰ کے ادب نامہ میں نہ صرف پرانے اورکہنہ مشق نام نظر آتے ہیں بلکہ نئے نام دیکھ کرآذر صاحب کی ادب شناسی کا احساس بھی ہوتا ہے۔ناصرضمیر کے بہت سارے افسانے کشمیرعظمیٰ میں شائع ہوئے

اور پسند بھی کیے گئے۔ میرا خیال ہے کہ ناصر ضمیر کی ادبی صلاحیتوں کو ابھارنے اور ایک اچھا اور معتبر افسانہ نگار بنانے کے لیے کشمیر عظمیٰ کے رول کو فراموش نہیں کیا جاسکتا اور میں جانتا ہوں کہ اس کا احساس ناصر ضمیر کو بھی ہے۔

ناصر ضمیر ریڈیو پروگراموں میں بھی حصہ لیتے ہیں۔ دور درشن کے ادبی پروگراموں میں بھی نظر آتے ہیں۔ ان پروگراموں کی نظامت بھی کرتے ہیں اور یہاں مقامی سطح پر منعقد ہونے والی ادبی تقاریب کی نظامت بھی خوش اسلوبی سے انجام دیتے ہیں۔ کلچرل اکادمی کے جریدہ ''شیرازہ'' میں اُن کی کہانیاں بھی شائع ہوتی ہیں۔ وہ نگینہ انٹرنیشنل کے لیے بھی لکھتے ہیں کئی ادبی تنظیموں کے سرگرم رکن بھی ہیں۔ جموں وکشمیر فکشن رایٹرس گلڈ کے چیف کا ڈِنیٹر بھی رہے ہیں۔ ادبی محفلوں اور مجلسوں میں بھی بھرپور شرکت کرتے ہیں۔ مختلف شاعروں کے اَن گنت اشعار ان کے ذہن میں محفوظ ہیں جنہیں وہ موقع ومحل دیکھ کر اپنے مخصوص لہجے میں پیش کرتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود مجھے ان سے شکوہ بھی ہے۔ میرے چاہنے اور کہنے کے باوجود جانے کیوں وہ اب بھی خاموشی اختیار کئے ہوئے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ وہ اپنی ادبی سرگرمیوں کا دائرہ وسیع کریں۔ یہ دائرہ بہت ہی وسیع ہوسکتا ہے جب وہ جموں کشمیر سے باہر شائع ہونے والے جرائد اور رسائل کے لیے لکھنا شروع کریں گے۔ مجھے یقین ہے کہ ملکی سطح پر اور اردو بستیوں میں ان کے افسانے ان کی پہچان بنانے میں ایک اہم کردار ادا کریں گے کیونکہ ناصر ضمیر کا اپنی بات ڈھنگ سے کہنے یا پیش کرنے کا جو انداز ہے وہ ذہن پر فوراً ہی اپنا اثر چھوڑ دیتا ہے اور یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ کوئی بھی کہانی پڑھنے کے بعد تخلیق کار کی ذہنی وسعتوں، اس کی توانائی اور قوت تخیل سے آگاہی ہوتی ہے لیکن میرے کہنے کے باوجود کشمیر سے باہر کے اخبارات، رسائل

اور جرائد میں اپنی کہانیاں شائع کرنے یا نہ کرنے کے تعلق سے ناصر ضمیر ہی فیصلہ لے سکتے ہیں۔

کاغذی لشکر کا سپاہی....!

یہ ناصر ضمیر کے پہلے افسانوی مجموعے کا نام ہے اور یہ مجموعہ عنقریب ہی منظر عام پر آ رہا ہے۔اس میں ۳۵ افسانے شامل کیے گئے ہیں۔اس مجموعے کے منظر عام پر آنے سے ناصر ضمیر کی ادبی زندگی کا تیسرا پڑاؤ شروع ہوتا ہے اور یہ اُن کی ادبی زندگی کا اہم پڑاؤ ہے اور یہ اُن کے ادبی سفر کے ایک نئے راستے کی جانب اشارہ کرتا ہے۔مجموعی طور پر اِن افسانوں کے مختلف کردار ہماری سماجی' ثقافتی' سیاسی' جذباتی' ذہنی اور نفسیاتی الجھنوں کے ساتھ سامنے آتے ہیں اور پھر الجھنوں سے دور رہنے کے لیے ہماری سوچوں کے دریچے بھی وا کرتے ہیں۔اندھیرے میں روشنی کی ایک کرن پھوٹتی نظر آتی ہے اور اس روشنی میں ناصر ضمیر کا منفرد اسلوب اور طرز فکر صاف صاف دیکھے جا سکتے ہیں۔تحریر میں الفاظ کا ضرورت کے مطابق استعمال اور جملوں کی بندش ان کے افسانوں کی ایک اور خوبی ہے اور یہی خوبی پڑھنے والے کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں۔اگر میں یہ کہوں کہ وہ افسانوں کو تکنیک بدل بدل کر لکھتے ہیں تو بے جا نہ ہوگا۔تخلیق شعری ہو یا نثری اس میں بڑی قوت ہوتی ہے اور پورے معاشرے کو بدل سکتی ہے یہاں تک کہ ہواؤں کا رخ پھیر سکتی ہے۔گذشتہ کئی برسوں سے ہمارے ہاں فکشن کے محاکمہ سے جو نسل ابھر آتی ہے وہ نسل صلاحیتوں سے مالا مال ہے اور اپنے طرز تحریر سے ادب کی آبیاری میں مصروف ہے۔میں الگ الگ سے کتاب میں شامل افسانوں کی بات نہیں کروں گا لیکن ناصر ضمیر کی ان کہانیوں یا افسانوں کا مطالعہ کرنے کے بعد ضرور احساس ہوگا کہ وہ کچھ نیا پیش کر رہے ہیں اور

شایداسی نئے پن میں ناصرضمیر کی کامیابی کا راز پوشیدہ ہے۔

یہ مت کہیے کہ ان افسانوں میں رومان نہیں، رومانیت نہیں، محبت اور پیار کا اضطراب نہیں۔ندی نالوں، آبشاروں، برف پوش پہاڑوں، پیڑ پودوں، رنگ رنگ کے پھولوں، نیلگوں آسماں پر اڑتے پرندوں کا ذکر نہیں ہے۔کشمیر کے حالات وواقعات کا ذکر نہیں ہے، کشمیر کے زخم خوردہ انسانوں کا ذکر نہیں ہے۔یہ سب کچھ ہے لیکن ایک منفرد انداز کے ساتھ اور یہ منفرد انداز ناصر ضمیر کا اپنا انداز ہے___ ان افسانوں کو پڑھتے ہوئے نیم تاریک راہوں سے گذرنے کا احساس ہوتا ہے لیکن ان تاریک راہوں میں گذشتہ یادوں کے کھوئے ہوئے کارواں بھی ملتے ہیں۔ان کی کہانیوں میں جتنے بھی موضوعات ملتے ہیں وہ انسانی رشتوں سے جڑے ہوئے ہیں۔!

ناصر ضمیر دل کی کتاب لکھنے میں کافی ماہر لگتے ہیں۔!

''کاغذی لشکر کا سپاہی'' میں شامل افسانوں کو پڑھنے کے بعد آپ اپنے آپ سے سوال کریں کہ کشمیر میں فکشن کے منظر نامے پر نظر ڈالنے کے دوران ناصر ضمیر کو آپ کہاں دیکھتے ہیں؟ جواب آپ کو ضرور مل جائے گا۔!

بہت بہت شکریہ!

نور شاہ

سرینگر

۵ مارچ ۲۰۲۰ء

☆☆☆

کاغذی لشکر کا سپاہی

نُدرت اور جدّت کا مِشرن

میرے عزیز ناصر ضمیر کا زیرِ نظر افسانوی مجموعہ ''کاغذی لشکر کا سپاہی'' اُس کے قلم سے خون کی تیز دھار کی طرح ٹپک پڑا ہے۔ اِس لال دھارے میں تیرنے کی کوشش کرتے ہوئے یہ تمہید لکھنے والا بھی اس کے سیلابی ریلے میں غوطے پر غوطے کھا رہا ہے۔ اُس کے بوڑھے جسم میں چند لوتھڑوں چند ہڈیوں کے سوا رکھا ہی کیا ہے۔ لیکن اُس کے معنوی وجود کی موت تو بالکل صریح ہے اور وہ اس کی تدفین کے لیے اپنے نحیف پٹھوں کی زنجیرِ عدل کو زور سے کھڑکانے میں مگن ہے۔ لیکن اس جرس کی آواز کو سُننے کا یارا کسی کو نہیں ہے۔ کیونکہ اِس زندہ مزار میں سبھی اپنے تن بدن کی آسودگی کے لیے گڈھے کھڈے تلاش کر رہے ہیں۔ افسانوں کی یہ سمرتی کہیں لمبی ہے اور کہیں چھوٹی، لیکن اس میں آج کی نیم مردہ دنیا کی آہ و بکا کے پس منظر میں آج کے کشمیر کی بڑی جنازہ گاہ کا خوف ناک اور رہولناک المیہ جارج آرویل (George Orwell) کے ۱۹۸۴ء کی کربنا کی کو اُجاگر کر کے آج کی گلوبلائزیشن کا خونین خاکہ بُنتا ہے۔ جیسے صبا کے جھونکوں میں ایک جوڑا بانہوں میں بانہیں ڈال کر اپنے ریشمی لمس سے سرشار ہوکر دوسری سانس میں خون کی قے کر کے زمین پر ڈھیر ہو جاتا ہے۔ دیکھئے مجموعے کا افسانہ ''من دریدہ سایہ'' جہاں کوئی تیاگی کسی

خوب صورت لڑکی کے ہاتھ چھونے کی لذت میں ڈوب جانے کے بعد خود اپنے سائے سے دست و گریباں ہو جاتا ہے۔ مگر یہ لطف کا احساس اُسے وصل کی نعمت کے بدلے صرف ابدی مکتی کے مرگھٹ کی راہ دکھاتا ہے۔ یہ سب کسی پلاٹ کی دین نہیں ہے۔ بلکہ صرف ڈائیلاگ کی سیڑھیاں طے کرنے سے ہو جاتا ہے۔ اسی لیے اِس سمرتی کو مکالمے کی سرگوشیوں کی بازگشت بناتا ہے۔ یہ مجموعہ آج کے لیپ ٹاپ کے Mouse کی طرح حرکت کر کے کبھی قاری کو برازیل کبھی امریکہ اور کبھی اٹلی کے اُن آباد خرابوں میں ٹرانسپورٹ کرتا ہے۔ جہاں چین کے چمگاڈروں سے اُڑنے والی کرونا نے شمشان اور قبرستان کے سارے اختلاف کو پاٹ دیا ہے اور صرف لاشوں کے انباروں پر نظر ٹکتی ہے۔ کتاب کے ایک اور افسانے ''خارزارِ محبت'' کو لیجئے۔ اس میں کوئی گمنام نہیں بلکہ مسیح اور شیریں جیسے نامور کردار کرتب دکھارہے ہیں۔ مکالمے کی عریانیوں سے لطف اندوز ہونے کے باوجود ڈرامے کے خاتمے پر ہچکی لیتے ہوئے دم توڑ دیتے ہیں۔ جیسے سعادت حسن منٹو کی موذیل ماتھن کا سواد چکھنے کے بعد اپنے اوپر ڈالے گئے آنچل کو دھکیلتی ہوئی مرگ آشنا ہو جاتی ہے۔ اب لیجئے ''اس جہانِ خراب میں'' والا افسانہ زینب اور ہیر و صرف مکالمے ادا کرتے ہوئے آج کل چاروں طرف عصمت ریزی کے واقعات کی ٹوہ لیتے ہیں اور اس میں دلی کی لڑکی کے گینگ ریپ کے بارے میں بڑے مبہم سے بڑے بھید بھاؤ سے گفتگو کرتے ہیں اور پھر نور کو زمین میں گاڑھنے کی بات ہوتی ہے۔ اب اُس کی اپنی بیوی سنتی ہے تو غش کھا کر زمین پر گر جاتی ہے۔ ایک اور چونکانے والا افسانہ ''ایک لیکھک کی موت'' ہے۔ جہاں ایک بھوکا ننگا، قلاش ادیب صبح جاگنے کے بعد دیواروں پر نظر ڈالتا ہے۔ جہاں اس کے کرداروں کے نام کہانیوں کے من پسند جملے۔ ایک آدھ پھڑکتا شعر میں لکھے

ہوئے ہیں اور او ہنری، موپاساں، چیخوف، منٹو اور پریم چند (ارے اسے شرمیلے شریف سے آدمی کو کس قحبہ خانے میں گھسیٹ لائے ہو) وہ اپنی فاقہ زدگی کو دور کرنے کے لیے چند لقموں کے واسطے اپنے افسانے ایک پبلشر کو بیچ دیتا ہے جو اسے کسی اور کے نام سے چھاپ دیتا ہے تا کہ بڑے نام کا جادو اس کی تجوری کو ٹھنا ٹھن کرا دے۔لیکن جب وہ ان چند ٹکوں کو لے کر ڈھابے میں پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے پہنچ جاتا ہے تو کھانا سامنے آنے پر اُسے اپنے اندر کچھ عجیب سا محسوس ہوتا ہے۔اس لیے کھانا کھانے سے پہلے اُسے خون کی قے ہو جاتی ہے''وہ سڑک پر غش کھا کر گر جاتا ہے اور بدلے میں ملے روپے اِدھر اُدھر بکھر جاتے ہیں''۔

یہ مجموعہ اردو میں اپنی قسم کے انوکھے انداز کا ہے۔اس کے پس منظر میں ڈونالڈ ٹرمپ کے خون آلودہ پنجوں کے ساتھ ساتھ ٹی، ایس، ایلیٹ کے Waste Land یعنی بین الاقوامی خرابے کا محشر اُبھرتا ہے۔جہاں ہاوہُو کے علاوہ ایٹمی بمباری کے ہیروشیما اور ناگاساکی بھی چشمِ تصور میں اُبھرتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ کشمیر کے اُس منظر میں پھر سے رنگ بھرتا ہے جو صدیوں پہلے ذولچو منگول نے کشمیر کی اینٹ سے اینٹ بجا کر اس میں صرف اور صرف گیارہ گھروندوں کو سالم رہنے دیا تھا۔

میں اس مجموعے کو کشمیر میں ایک تازہ اگرچہ ''برم برم چوک''[1] کے سر پر

---

[1] برم برم چوک۔کشمیر کا ایک دیومالائی خونریز کردار ہے جس کے بارے میں روایت ہے کہ اُس کے سر پر ایک آگ کا اَلاؤ جلتا رہتا ہے۔لیکن اُس کے بازو اور ٹانگیں شکاروں کو ہلاک کر کے اپنا لقمہ بناتی ہیں۔

اَلاؤ اور قدموں میں غارت گری کے نقوش ابھارنے والا مرگِ مفاجات کا عالم پیدا کرنے کی نوبت بجانے والا سمجھتا ہوں ایسا لگتا ہے کہ مہا بھارت کا شُکنی اور الف لیلیٰ کا دیوِ سفید باہوں میں باہیں ڈال کرتانڈو کی مشق کر رہے ہیں۔

محمد یوسف ٹینگ

راؤلپورہ سرینگر

۲۶ مارچ ۲۰۲۱ء

☆☆☆

بے ادبی ذرا ادب سے پہلے...

برصغیر کے نامور ادیب، فکشن نگار، طنز و مزاح نگار و مترجم جناب ابنِ اسماعیل صاحب اللہ انہیں جنت نصیب کرے جن کی ادارت میں مؤقر ادبی جریدہ ''بزمِ ادب'' نکلتا تھا۔ اکثر ہماری قوم کو ''اخباری قوم'' کہتے تھے۔ وجہ پوچھنے پر فرمایا کہ ـــــ

> ''یہ قوم اخبار سے زیادہ کچھ نہیں پڑھ سکتی اسی لیے اسے اخباری قوم کہتا ہوں اور اس پر ستم ظریفی یہ کہ یہ قوم اخبار بھی صحیح معنوں میں نہیں پڑھ پاتی۔ یعنی دس لوگ ایک ہی خبر کے دس طرح کے معنی بتائیں گے''۔

پر میں اس قوم کو اسی سے ملتا جلتا نام دیتا ہوں۔ ''فیس بُک قوم'' یعنی ہمارے عقیدے سے لے کر ادب تک، علم سے لے کر عمل تک، سیاست سے لے کر سیاہ ست، فتویٰ، افواہ، دعویٰ ہر چیز فیس بُک پر طے ہوتی ہے۔ ایسے میں یہ امید رکھنا کہ اقدار کا تحفظ، روایت کی پاسداری، تہذیب کی سلامتی یا معیاری ادب پھل پھول سکے گا ایک احمقانہ سوچ کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

ادب کچھ سکالرز' چند زر خرید غلاموں' نام نہاد نقادوں یا ادب کے ٹھیکیداروں و ادبی انجمن سازوں کی رقاصہ ہے۔ادب کچھ لوگوں کے لیے روزی روٹی کا ذریعہ' اعلیٰ منصب کے حصول یابی کی راہ' جبلتِ خودنمائی کا چسکا یا پھر مسخرہ پن ہوسکتا ہے اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔

ایک مفکر نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا____

''ادب کے اقدار کی ذمہ داری کون سنبھالے گا۔ کیونکہ جن کو یہ سب کرنا چاہیے تھا انہوں نے شادیاں کیں' بچے پیدا کیے' زمینیں خریدیں' مکان بنائے اور سڑکوں پر گاڑیاں دوڑائیں''۔

ایسے میں آپ کا یہ سوال ہوسکتا ہے کہ جب میں موجودہ ادبی منظر نامے سے اور ادب و زبان کے چیلے چپاٹوں سے اتنا خفا ہوں تو یہ کتاب لے کر منظرِ عام پر آنے کی کیا تُک ہے! اس کا جواب یہ ہے کہ یہ صرف ایک دوست کا اصرار ہے اسی ظالم نے اس کتاب کا بھیڑا اٹھایا اور جب تک اسے پائے تکمیل تک نہ پہنچایا دم نہیں لیا۔

ورنہ آج کل کے دور میں جہاں لوگ انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا کے نشے میں دھت پڑے ہیں۔انٹرنیٹ پر ان کے لیے بے شمار سیکس اور کرائم سے بھری ننگی' فحش اور تھرلنگ ویب سیریز موجود ہیں۔ ہر طرف تفریح کے نت نئے وسائل و سامان میسر ہیں تو ایسے میں انہیں کونسی چیز ادب پڑھنے پر مجبور کرسکتی ہے! شاید کوئی نہیں۔ جی ہاں بالکل اس کتاب میں شامل ان ٹُنڈ مُنڈ کہانیوں کو پڑھ کر بھلا کسی کا کیا بھلا ہوسکتا ہے! شاید کسی کا نہیں۔

صاحب دنیا بارود کے ڈھیر پر کھڑی ہے۔انسانیت کا جنازہ اٹھ چکا ہے۔ در پردہ جنگیں لڑی جارہی ہیں۔ بیولوجیکل ویپن سے جنگ لڑنے کی تیاری ہے۔ہم نے سیاست دان کو خدا بنا ڈالا ہے گویا کہ بس اسی کے پاس انسان کے ہر مسئلے کا حل ہو' تو ایسے میں ہم ادب سے کیا امید لگا سکتے ہیں!اور کیوں؟

رہی سہی کسر Fake میڈیا نے نکال دی۔میڈیا نہ ہوا مچھلی بازار ہوا۔

ہم اس مردہ خانے میں دفن ہیں جس کی چوکیداری پر بے چارے ادیب کو معمور کر دیا گیا ہے۔ ہر وقت' ہر آن' ہر قدم پر اسے ہی جواب دہ ٹھہرایا جاتا ہے۔ کیوں لکھا؟ کیسے لکھا؟ کاہے کو لکھا؟ اور وہ بکری کے بچے کی طرح ہاتھ جوڑے میمیاتے ہوئے صفائیاں دیتا پھرتا ہے۔

ایسے میں چند انگریزی ادیبوں کو چھوڑ کر مجھے کوئی روشنی' کوئی امید نظر نہیں آتی۔ مجھے یہ بات کہنے میں کوئی جھجک نہیں کہ ان الٹی سیدھی کہانیوں کا کہانی کار فرسودہ روایات' ان کلابازیوں جو آج کل ادبی دنیا میں ہو رہی ہیں سے اوب چکا ہے۔

یہ افسانے بہت پہلے منظر عام پر آنے چاہیے تھے۔ بس طبیعت مائل بہ اشاعت نہ ہوئی اور برسوں یہ افسانے کتابی صورت میں آنے سے رہے۔اللہ بخشے جناب پروفیسر حامدی کاشمیری صاحب کو' بہت عرصہ پہلے انہوں نے ناچیز کے افسانوں پر چند جملے لکھ کر حوصلہ افزائی فرمائی۔مگر بدقسمتی کہیے یا میری کوتاہی وہ کاغذ کہیں تلف ہوا جس کا قلق مجھے عمر بھر رہے گا تاہم میں مرحوم کی محبتوں کا مقروض ہوں اللہ ان پر اپنی جوارِ رحمت برسائے۔ میں شکر گذار ہوں قبلہ محمد یوسف ٹینگ صاحب کا جنہوں نے ان کہانیوں پر کچھ کہنے کی زحمت فرمائی۔ سپاس گذار ہوں جناب نور شاہ صاحب کا

جنھوں نے اپنے زریں خیالات سے نوازا۔ میں بے حد مشکور ہوں جناب جاوید آذر صاحب کا جنھوں نے ان افسانوں کو معروف روز نامہ اخبار 'کشمیر عظمیٰ' کے ادب نامہ میں گاہ بہ گاہ شائع کر کے میری حوصلہ افزائی فرمائی گروہ پلیٹ فارم میسر نہ آتا میں شاید اپنے حلقے تک ہی محدود رہتا۔ کبھی سوچا بھی نہیں تھا دو احباب کے کہنے پر جس ادبی انجمن کی داغ بیل ہم نے ساتھ میں مل کر ڈالی وہ ایک مستحکم ادارے کی شکل اختیار کرے گا اور بالخصوص فکشن کے حوالے سے اچھا خاصا کام انجام دے گا اور مجلسی ادب کو فروغ بھی ملے گا۔ میری مراد جموں و کشمیر فکشن رائٹرس گلڈ سے ہے امید ہے گلڈ اسی طرح فکشن کی خدمت کرتا رہے گا۔ میں اس ادارے سے منسلک ہر شخص کا فرداً فرداً شکریہ ادا کرتا ہوں۔ جناب شوکت عباس صاحب کا شکریہ جنھوں نے اس کتاب کی کمپوزنگ کی۔

میکسیم گورکی نے کہا تھا____

''ہم سب پیار کے بھوکے ہیں اور بھوک میں جلی ہوئی روٹی بھی اچھی لگتی ہے''۔

یہ افسانے بھی جلی ہوئی روٹیاں ہیں۔

ناصر ضمیر

☆☆☆

نَمک

''جی یہ آپ کی امانت''
اس نے ڈائری ہاتھ میں لی اور پہلا صفحہ پلٹا
''ہیلو باواری میں پال تمہارا اژاں پال
کیسی ہو؟''

یاد ہے جب میں نے اپنے ہونٹ تمہارے گرم نازک اور پتلے ہونٹوں پر رکھنے چاہیں تو تم نے اپنا بایاں ہاتھ درمیان میں حائل کر کے میرے منہ پر رکھ کر مجھے روک دیا۔ کیا تمہیں یاد ہے؟

اور تم نے اچانک سے کہا
''کیا تم مجھ پر کوئی کہانی لکھو گے؟''
''کیا مطلب!''میں نے حیرانگی سے پوچھا
''اچھا چلو کہانی نہ لکھو کم سے کم مجھے کسی کردار میں ڈھال تو سکتے ہو''۔
''یہ کیا سوجھی آج تمہیں؟''میں نے حیرت سے پوچھا
''کہو کرو گے نہ ایسا؟''تم نے ضد کی۔
''اچھا ٹھیک ہے ایسا ہی کروں گا اب خوش''
او پال تم کتنے اچھے ہو.....''

میں نے پھر تمہارے نرم و نازک ہونٹوں پر اپنے سلگتے ہونٹ رکھنے چاہیں تو
تم نے پھر مجھے روک کر کہا۔

''پر میری ایک شرط ہے''

''بھلا کیسی شرط؟''

''بتاتی ہوں بتاتی ہوں''

''اس بار تم کچھ نیا لکھو گے''

''نیا!''

''ہاں نیا''

''میں کچھ سمجھا نہیں''

''میرا مطلب بالکل نیا جو.....یا جیسا ابھی تک کسی نے نہیں لکھا ہو.....''

اوووو

''کیا تمہیں لگتا ہے میں برا لکھتا ہوں....'میں نے معصومیت سے پوچھا۔

''ہاں.....بالکل''

''کیا کہا؟'' میں بھڑک اٹھا

''اس میں غصہ ہونے کی بات نہیں یہ سچ ہے''۔

''تم ہی نہیں بلکہ تم سب برا لکھتے ہو' تم سے پہلے جو تھے انہوں نے بھی اور جو شاید تمہارے بعد آئیں گے وہ بھی..... تم سب ایک دوسرے کے لکھے ہوئے کو دوبارہ..... دوبارہ ہی نہیں بلکہ بار بار لکھتے ہو۔تم سب کا لکھا ہوا ایک دوسرے کی کاپی ہے۔ہاں یہ سب ایک دوسرے کی کاپی ہے''۔

''ہر دفعہ پڑھ کر لگتا ہے کہ پہلے بھی کہیں پڑھا ہے''۔

میں حیران، پریشان تمہیں دیکھتا رہا۔ پہلے مجھے لگا تم مذاق کر رہی ہو، پر بعد میں محسوس ہوا نہیں تم بالکل سنجیدہ ہو۔ مجھے یقین نہیں ہو رہا تھا۔

پھر تم نے کہا ''تمہیں یاد ہے نا''

پھر تم نے کہا

''تم سب کے لکھے ہوئے میں کوئی سواد نہیں..... کوئی ذائقہ نہیں۔ سب بدمزا ہے۔ ایک دم بدمزا..... ان سب میں ''وہ'' ہے ہی نہیں''۔

''وہ کیا؟''

میں نے اشتیاق سے نہ صرف پوچھا بلکہ میں لگ بھگ چلایا۔

''وہ کیا کہتے ہیں اسے'' نمک..... اس میں نمک ہے ہی نہیں...''

''ایک وعدہ کرو....''

''کیسا وعدہ؟ میں بڑبڑایا...

''تم جب مجھ پر کہانی لکھو گے۔ یا مجھے کسی کردار میں ڈالو گے۔ تو تم بے ذائقہ اور بدمزا نہیں لکھو گے بلکہ تم اس میں وہ ''نمک'' بھی لانا سمجھے نا۔ وہ نمک بھی لانا۔ وعدہ کرتے ہو نا''۔

..... میں کچھ سمجھ ہی نہیں پایا اور میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

''...وعدہ''۔

اور... اور تم چلی گئی۔ میں بہت دیر تک ایسے ہی مبہوت رہا ایک دم حیراں پریشان..... بس پھر کیا تھا میں گھر گیا کمرے میں رکھی کتابیں کھنگالنے لگا کچھ کہانیاں پھر ایک بار پڑھیں..... تمہاری کہی ہوئی باتیں کچھ کچھ سچ لگنے لگیں۔ دوسرے دن لائبریری گیا کچھ اور کتابوں کی ورق گردانی کی۔ اب تمہاری کہی ہوئی باتیں اور بھی سچ

لگیں.... میں اس بات پر حیران تھا کہ ایک خوب صورت دوشیزہ جو خوش قسمتی سے میری محبوبہ بھی ہے، نے دنیا میں تخلیق کیے گئے ادب پر سوال اٹھایا ہے اور اسے ایک دوسرے کا چربہ بتایا..... میں سوچنے لگا کہ تم زیرک زیادہ ہو یا پھر شاطر..... کہیں تم نے مجھے الجھائے رکھنے کے لیے کوئی پینترا تو نہیں کھیلا۔ تا کہ میں تمہارے پاس نہ آسکوں یا تمہیں ہمیشہ کے لیے اپنا نہ بنا سکوں۔ کہیں تم مجھ سے پیچھا تو نہیں چھڑانا چاہتی تھی۔

میں کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا پر مجھے اپنا وعدہ یاد آیا.... وعدہ

ہاں وعدہ... میں اکثر تم سے کہا کرتا تھا ''محبت میں ایک وعدے پر عمریں گزاری جا سکتی ہیں''۔ اسی لیے میں..... ہاں میں نکل پڑا.... نکل پڑا کہانی کے نمک کی تلاش میں ایک انجانے سفر پر.... بے سمت سفر پر.... بنا سوچے بنا سمجھے.... بنا جانے کہ اس کا انجام کیا ہوگا.... بس نکل پڑا۔

میں چلتا گیا.... ریل، بس، ٹیکسی یا پھر پیدل.... بس چلتا ہی گیا۔ مجھے وہ کہانی یا پھر وہ کردار چاہیے تھا جس میں تم ڈھل سکو اور حیات جاوداں پا سکو۔ جس میں، میں تمہیں تمہاری مرضی کے مطابق الفاظ میں قید کر سکوں اور وہ قید ابدی ہو۔

موسم بدلے، رت بدلی، وقت کا کانٹا گھومتا رہا گھومتا رہا، فصلیں بوی گئیں، کاٹی گئیں اور پھر بوی گئیں.... پھر کاٹی گئیں... پر... پر... میرے پیر نہیں رُکے... میں تلاش میں رہا۔ ہر وقت، ہر لمحہ، بس محوِ جستجو۔

تم یاد آتی رہی تمہارا حسن، تمہاری آنکھیں، نیلی بڑی بڑی گہری آنکھیں، جن میں، میں سرتا پا ڈوب چکا تھا۔ گول بھرا ہوا سفید چہرہ، خوب صورت ستواں ناک، تیکھے نقوش مناسب قد و قامت اس پر سنہرے لمبے بال جو عموماً چوٹی کی شکل میں

تمہاری کمر پر جھولتے رہتے۔ بے حد پر کشش بدن اُف..... کئی بار چاہا اپنی قسم توڑ کر آؤں‘ اور تم سے معافی مانگوں اور کہوں کہ میں اپنا وعدہ پورا نہ کر سکا۔ مجھے معاف کر دو اور اپنے قدموں میں جگہ دو۔ پر..... پر..... میرے اندر کے کہانی کار نے ہمت نہ ہاری اور میں نے اپنی تلاش جاری رکھی کہ کہیں نہ کہیں کبھی نہ کبھی مجھے..... اور یہ سب کرتے کرتے میں آلام اور مصائب کی تصویر بنتا گیا۔اذیتوں اور مصیبتوں کی کبھی نہ ختم ہونے والی داستان۔

تمہیں پتہ ہے ایک دن میں بھوکا تھا کہ کسی نے کتے کو روٹی ڈالی۔ یقین جانو کتے اور میں نے روٹی ساتھ میں کھائی.....

جانور انسان کی طرح خود غرض نہیں ہوتے۔

ایک رات..... ہاں ایک رات کچھ زیادہ ہی اندھیرا تھا نہ جانے کیوں مجھے ڈر لگا۔ بے حد ڈر‘ میں نے ایک بنیے سے ایک رات کی پناہ مانگی تو اس نے مجھ پر ترس کھا کر مجھے اپنے گودام میں رہنے دیا اور باہر سے تالا لگایا اور خود گھر چلا گیا مجھے لگا سڑک پر سونے سے بہتر ہے کہ چار دیواری میں رات کاٹی جائے پر..... پر..... مجھے کیا معلوم تھا وہ رات قیامت کی رات ہوگی اس گودام میں بڑے بڑے چوہے تھے بہت سارے بڑے بڑے چوہے جو مجھے دیکھ کر ہڑ بڑائے اور مجھے رات بھر دوڑیا‘ بھگایا اور میں بند گودام میں کانپتا رہا‘ چیختا چلاتا رہا۔

ایک..... برستی‘ بھیگتی رات میرے اوپر کوئی چھت نہ تھی میرے پاس صرف ایک اخبار کے چند پنے تھے اور ان گیلے اخبار کے پنوں تلے میں بھیگتا رہا..... بھیگتا رہا اور تمہیں یاد کرتا رہا..... یاد کرتا رہا کہ جب میں نے تمہاری ہتھیلی پر پہلی بار تازہ گلاب چمکایا تھا اور تم شرما گئی تھی۔

میں جب بھی زیادہ تکلیف میں ہوتا تو تمہیں اور شدت سے یاد کرتا اور تم کو تصور کی آنکھ سے دیکھ لیتا۔ دن کی چلچلاتی دھوپ میں دوپہر کو جب سارے ماحول پر اونگ طاری ہوتی۔ مجھے یہ خیال آتا کہ تم اس وقت میوزک کلاس میں سنگیت سیکھ رہی ہوگی۔ کوئی راگ چھیڑا ہوگا تم نے، لمبی تان لی ہوگی اور الاپ کی مشق سے تمہارے گالوں پر سرخی چھائی ہوگی۔

یا پھر کسی سرمئی شام کو خیال آتا کہ تم اس وقت ڈانس کلاس میں نرت سیکھ رہی ہوگی نئے سٹپ، نئے انداز.... کچھ نئے ٹھپ، نئے ڈھنگ تمہاری کمر پر سنہرے بالوں کی لمبی چوٹی بھی تمہارے قدموں کی تھرکن کا ساتھ دے کر مزید ہلکورے کھا رہی ہوگی۔ چہرے پر رس کے کئی بھاؤ مچل رہیں ہوں گے اور اس جسمانی مشقت سے تمہاری سانسیں پھول گئیں ہوں گی، ماتھے پر پسینے کی بوندیں چمک رہی ہوں گی۔

میں جب بھوکا ہوتا اور بھوک میری برداشت سے باہر ہوتی تو میں.... میں وہ.... وہ.... کلفی یاد کرتا جو ہم ساتھ ساتھ کھاتے اور اکثر کھاتے کھاتے میں آپس میں پیالیاں بدل دیا کرتا اور ایسے میں، میں تم سے اکثر کہتا کہ ''ایک دوسرے کا جھوٹا کھانے سے محبت بڑھتی ہے...''

باواری تم یہ سوچ رہی ہوگی کہ میں تم سے کیا ہوا وعدہ شاید بھول گیا.... نہیں بالکل نہیں.... ذرا بھر بھی نہیں.... رتی بھر بھی نہیں.... بلکہ میں نے کئی بار کوشش کی کہ ایسا لکھوں جو پہلے کسی نے نہ لکھا ہو۔ بالکل نیا، اوروں سے الگ.... پر....، تم تمہارا حسن یا میرا عشق، یا پھر یوں کہوں ہماری محبت کسی کہانی میں ڈھلتی نظر نہیں آ رہی ہے.... کچھ نہیں ہو پایا اب تک.... وقت بھی تیزی سے گزر رہا ہے اب مجھے نئے نئے شکوک وشبہات نے گھیر لیا ہے کہ کہیں.... کہیں تم نے میرے انتظار میں ہار تو

نہیں مان کر تھک گئی ہوگی اور کسی سے شادی تو نہیں کر لی ہوگی۔ کہیں تم دو خوب صورت بچوں کی ماں تو نہیں۔ کیا پتہ تمہارا شوہر ... اُف ... میں ایسا سوچتے ہوئے بھی گھبرا جاتا ہوں۔ ہاں تو میں اس رات کا ذکر کر رہا تھا اسی رات کا کہ جس رات میں اخبار کو چھتری بنائے بھیگ رہا تھا رات کو سردی اتنی زیادہ بڑی کہ صبح ہوتے ہوتے میں بے ہوش ہوگیا پھر جب ہوش آیا خود کو ایک بیڈ پر پایا وہ انات آشرم کا کمرہ تھا جس کے نگراں نے از راہِ انسانیت مجھے یہاں لایا تھا۔ اب ساری سکت جواب دے گئی ہے۔ کھانسی رکنے کا نام نہیں لے رہی ہے۔ ابھی بھی یہی پڑا ہوں پر بہت جلد یہاں سے بھی نکل جاؤں گا۔ ابھی ہمت اور طبیعت نے جواب جواب....

پر یہاں سے تو جانا ہی پڑے گا۔

باواری تم مایوس مت ہو

نئے موسم کی آمد ہے' کونپلیں پھر پھوٹ آئی ہیں' تازہ بہار آنے والی ہے۔

باواری وقت کتنا گزرا ہے مجھے یاد نہیں پر ایک خوش خبری سنانی ہے تمہیں۔ تم کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ میں نے وہ کہانی لکھ لی ہے اور بالآخر تم ایک عظیم کردار میں ڈھل چکی ہو۔''اب تو خوش ہونا؟''

وہ پڑھتے پڑھتے رُک گئی کیونکہ ڈائری کے آگے کے صفحات بالکل خالی تھے جن پر کچھ بھی نہیں لکھا تھا کہ اسی وقت دروازہ کھلا اور

''لاش''۔

انات آشرم کے نگراں نے باواری سے کہا

چلئے آجایئے میڈم

کیا آپ مسٹر ژاں پال کی لاش لے جانے کے لیے تیار ہیں؟''۔ ☆☆

من دریدہ سایہ

گوتم بدھ آنکھیں بند کر کے دھیان میں محو ہیں۔

یہ پینٹنگ دیکھ میرے قدم خود بہ خود رک جاتے ہیں اور میں اس تصویر کو دیکھنے میں کچھ ایسا کھو جاتا ہوں کہ بس پھر کسی چیز کی کوئی خبر ہی نہیں رہتی۔

کیا میں دھرم کے راستے پر چلنے والا ہوں؟

کہیں یہ سب اس بات کا اشارہ تو نہیں!

پر میں نے تو کبھی بھی ان باتوں کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ میرے نزدیک تو دنیا میں صرف دو ہی مذہب ہیں اور شاید ہمیشہ رہیں گے ایک امیری اور دوسرا غریبی۔

میں بھی کن باتوں میں الجھ گیا ہوں اُف میرا بازو دکھ رہا ہے یہ موٹی کتاب کافی دیر سے ایک ہاتھ میں تھامے ہوئے ہوں۔

واہ یہ پینٹنگ....

بس یہ پینٹنگ دیکھتے ہی میری دنیا رک سی جاتی ہے، تھم سی جاتی ہے۔

کیا آٹھ چالیس کی گاڑی ابھی ہوگی یا پھر نکل چکی ہوگی۔ ذرا گھڑی دیکھتا ہوں.....

ارے ابھی تو ٹائم ہے۔

اس مصور کو داد دینی ہی پڑے گی جس نے یہ غضب کی تصویر بنائی ہے۔

''ارے بھائی جگہ چھوڑو.... کیوں بیچ راستے میں کھڑے ہو؟''

راہ چلتا ہوا شخص مجھ پر کچھ غرایا۔

ٹی سٹال کے اندر دیوار پر لٹکتی ہوئی یہ پینٹنگ روز میرے پیروں میں زنجیر ڈالتی ہے اور میں ایک مجبور قیدی کی طرح بے بس و لاچار ہوجاتا ہوں اور اسے گھورنے لگتا ہوں.... اور پھر گھورتا ہی رہتا ہوں۔ ٹی سٹال میں بیٹھے لوگ اس شہکار پینٹنگ سے بے خبر چائے پیتے رہتے ہیں، سگریٹ پھونکتے رہتے ہیں۔ سگریٹ سے یاد آیا مجھے بھی سگریٹ کی بڑی طلب لگی ہے۔

واہ کیا پینٹنگ ہے

سگریٹ کا پیکٹ کہاں ہے؟... کہاں ہے؟... کہاں ہے؟... ارے یہ رہا۔

دنیا کو گیان دھیان کا مارگ دکھانے والا سچائی اور امن کا دیوتا... دیکھو کس طرح دھیان میں محو ہے۔

بھلا کیوں نہ ہو۔

پر اس کی بتائی ہوئی چار سچائیاں اور اس کے دکھائے ہوئے آٹھ راستے کہیں کھو گئے ہیں ہم سے....

ویسے بھی لوگ دھان دھرم بھول ہی گئے ہیں۔ میں بھی تو کچھ بھول رہا ہوں۔

کام

کام؟.... ہاں وہ کام.... جس کے لیے میں نکلا ہوں۔

پر ابھی تو فرصت ہے....

آج کی اس مصروف دنیا میں کیا واقعی کسی کو فرصت ہے جو مجھے ہوگی؟ کسی کو بھی تو نہیں۔ مجھے بھی نہیں ہے.... اوروں کی طرح مجھے بھی فرصت نہیں ہے.... بالکل

ہی نہیں ہے.... ذرا بھر بھی نہیں ہے۔
اس لیے مجھے آگے بڑھ کر اپنے کام پر جانا ہوگا....
کام؟؟؟
پر کام پر تو روز ہی جاتا ہوں۔ کیوں نہ آج....
کیوں نہ آج آوارہ گردی کی جائے۔
بھلا مجھے کسی اور کو بتانے کی ضرورت ہی کیا ہے کہ میں دن کہاں گزار آیا ہوں۔
''ارے تم''
''تم پھر آ گئے''
''کیوں میرا پیچھا نہیں چھوڑتے؟'' جب بھی کہیں جاتا ہوں وہیں پر نظر آتے ہو۔ ''کیوں مجھے اکیلے نہیں چھوڑتے؟ میں روشنی میں آیا نہیں کہ چلے آتے ہو۔ آخر کیوں میرا پیچھا کر رہے ہو۔ ہر جگہ ہر طرف مجھے گھیرے رہتے ہو۔ مجھے اکیلا چھوڑ دو بالکل اکیلا....
''جاؤ یہاں سے....''
کم بخت کہیں کا۔
پاگل کر رکھا ہے اس نے..... سارا موڑ خراب کر دیا۔
ایک اور سگریٹ سلگانی پڑے گی۔
آہ یہ پینٹنگ
اس کو دیکھنے میں کتنا آنند ہے، کتنا سکون ہے جیسے موکش کا مارگ مل گیا ہو۔
موکش!
کاش موکش کا مارگ مل جائے بس ایک بار موکش کا مارگ مل جائے تو

میں اُسی پت پر چلنے کے لیے تیار ہوجاؤں او ر دنیا کے سارے سکھ سارے دکھ....

''مجھے برگت کا پیڑ اچھا لگتا ہے پتا ہے کیوں؟''

کیوں بھلا؟

''کیونکہ میں بھی اس کے نیچے رہ کر۔سادھنا کروں گی ۔ ہاں برسا برس سادھنا کروں گی اور پھر مکتی.....''

''تم کیوں ایسی باتیں کرتی ہو

مجھے خوف آتا ہے۔کیا یہ کوئی عمر ہے ایسی باتیں کرنے کی'ایسا کچھ سوچنے کی؟''

''کیوں؟''

''اس میں کیا خرابی ہے؟''

''خرابی؟''

''خرابی ہی تو ہے۔تبھی تو کہہ رہا ہوں''

''کیا تمھیں نہیں لگتا کہ تم وقت سے پہلے ہی بوڑھی ہوگئی ہو؟''

''اچھا جی! تو آپ کو ایسا لگتا ہے۔چلئے جیسے آپ کی مرضی' نہیں کروں گی آیندہ ایسی باتیں پر....''

''پر کیا؟''

''ایک بات یاد رکھیئے گا اگر مجھے آپ نہیں ملے تو میں ساری دنیا تیاگ کر نروان کی تلاش میں نکل پڑوں گی''۔

''یہ کیا بکواس ہے؟''

حضور یہ بکواس نہیں سچ ہے خیر آپ نہیں سمجھیں گے''۔

''آ جایئے یہاں اوپر بیٹھیے میرے پاس''۔

''نہیں میں یہیں پر ٹھیک ہوں۔تمہارے چرنوں میں' مجھے یہیں پر رہنے دو یہی میری جگہ ہے بس مجھے یہی پر رہنے دو' اپنا داس بن کر''۔

''کیوں؟''

''کیونکہ تم دیوی ہو اور میں تمہارا داس''

''ایسا نہیں کہتے''۔

''کیوں نہ کہوں؟ یہی تو سچ ہے اور تم سچائی کی دیوی ہو''۔

''کیا میں تمہارے ہاتھ چھو سکتا ہوں؟''

شرم اور جھکی نگاہیں۔

''ہائے آپ کے ہاتھ کتنے کھردرے ہیں شاید خشک سردی کی وجہ سے' رُکیے میں ذرا کریم مَلتی ہوں''۔

پھر اس نے میرے ہاتھوں پر کولڈ کریم مَلی اور میرے ہاتھوں کو سہلانے لگی۔کریم کی چکناہٹ اور اس کے نازک ہاتھوں کے لمس سے میرے اندر عجیب سی کیفیت' ایک عجیب سی سرشاری سرائیت کرنے لگی اور ہم دونوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ایک دوسرے کو بہت ہی پیار سے دیکھا اُف وہ نیلی بڑی بڑی آنکھیں۔پھر یک لخت ہم دونوں نے اپنے اپنے ہاتھ چھوڑ اے۔

''ارے تم!''

''تم پھر آ گئے کتنی بار کہا ہے تم سے مجھے میرے حال پر چھوڑ دو مجھے مت گھیرے رہو''۔

''میں تنگ آ چکا ہوں تم سے۔کتنی بار کہوں۔میں تنگ آ چکا ہوں تم سے''

''جاؤدفاں''

''جاودفاں یہاں سے''

''محبت بڑی نعمت ہے حضور، پر اس کی قدر ہونی چاہیے اور جو اس کی قدر کرے وہ شاہ اور جو اس کی توہین کرے وہ.....''

''وہ کیا؟''

''کچھ نہیں، آپ نہیں سمجھیں گے''۔

''اتنا بتایئے''

''کیا؟''

''کیا آپ اس نعمت کی قدر کریں گے؟''

''ہاں ہاں بالکل''۔

''ویسے بھی میں تمہارے بغیر جی نہیں سکتا''۔

''صرف کہتے ہی رہیں گے یا پھر کبھی کر کے بھی دکھایں گے''

''کیوں نہیں!''

''تم دیکھنا ایک دن میں کر کے بھی دکھاؤں گا۔بس میرا انتظار کرنا۔ بہت جلد وہ دن آئے گا جب تم ہمیشہ کے لیے میری ہو جاؤ گی''

''پر وہ دن کب آئے گا؟''

''بہت جلد''

''میرا یقین کرو''۔

''کیا میں تمہارا ہاتھ پھر سے چھو سکتا ہوں؟''

''پھر تھوڑی ہی دیر میں نہ صرف اس کے نرم و نازک ہاتھ میرے ہاتھوں

میں تھے بلکہ اس کا سر بھی میرے شانوں پر تھا۔
میں دنیا کا سب سے زیادہ خوش نصیب ہوں۔
''ارے تم''
''تم پھر آ گئے''
''مت کرو تنگ مجھے''
''کتنی بار کہوں مت کرو تنگ مجھے' مت غصہ دلاؤ۔ مجھے تنہا چھوڑ دو
مہربانی کر کے مجھے تنہا چھوڑ دو''
''کافی وقت گزر گیا ہے جناب اب آپ کو کوئی قدم اٹھانا چاہیے ورنہ ہم ایک دوسرے سے.....''
اور وہ رو پڑی
''روتی کیوں ہو؟''
''دیکھئے اگر ہم ایک نہ ہوئے' تو میں ٹوٹ جاؤں گی' بکھر جاؤں گی۔
''اچھا دیکھو رونا بند کرو''
''سچ کہتی ہوں''
''کبھی کبھی من کرتا ہے سب تیاگ کر بھاگ جاؤں' موکش کے مارگ پر اور نروان پراپت کروں''
''یہ سب کیا سوچتی رہتی ہو؟ کہیں پاگل تو نہیں ہوگئی ہو۔ تم ایک اچھی خاصی پڑھی لکھی اور خوب صورت لڑکی ہو اور میں بھی اگر اللہ نے چاہا تو جلد ڈاکٹریٹ ہو جاؤں گا۔ ہمیں ان سب گیان دھیان کی باتوں کے چکر میں نہیں پڑھنا چاہیے۔''
اُف جلتی سگریٹ سے انگلیاں جل گئیں۔

جن سب باتوں کو بکواس سمجھتا تھا۔ اب انہیں سب باتوں کے لیے خود ترس رہا ہوں۔ موکش کے مارگ کے لیے، نروان کے لیے

اور برسوں بیت گئے

نہ مجھے موکش کا مارگ ہی ملا اور نا ہی نروان پراپت ہوا۔

بھلا ہوتا بھی کیسے

عین اس دن، بالکل اسی دن جس دن کا وعدہ کیا تھا میں نے، وعدہ کیا تھا اسے ہمیشہ کے لیے اپنا بنانے کا، ہاں اسی دن میں....

میں بھاگ کھڑا ہوا۔

وہ انتظار بس انتظار کرتی رہی۔

میرا نام بھگوڑا ہونا چاہیے یا پھر بزدل؟ ابھی تک طے نہیں کر پایا۔

مجھے لگا میں نے اسے دھوکا دیا ہے پر نہیں دراصل میں نے اسے نہیں بلکہ خود کو دھوکا دیا۔

اب بھاگ رہا ہوں.... چھل سے.... کپٹ سے.... موہ سے.... مایا سے.... یا پھر خود سے.... دو رمکتی کی تلاش میں.... پر نصیب نہیں ہو رہا، کچھ بھی نصیب نہیں ہو رہا ہے۔

ایسے میں بس مجھے یہ مہاتما بدھ کی پینٹنگ....

یہ شانت اور دھیان میں ڈوبا ہوا مکھ....

پتا نہیں کیوں مجھے اب لگ رہا ہے کہ میں اب اس سنگھرش میں کامیاب ہو جاؤں گا.... ہاں بالکل مجھے ایسا ہی لگ رہا ہے اب میں جلد ہی اس سنگھرش میں کامیاب ہو جاؤں گا اور مکتی پاؤں گا۔

''ارے تم''

''تم پھر آ گئے؟''

''کیوں پریشان کر رکھا ہے؟''

''کتنی بار کہا ہے تم سے مجھے تنہا چھوڑ دو''۔

''کیا کروں میں اس کا' اسی کا' جو مجھے کہیں اکیلا نہیں چھوڑتا؟'' ہمیشہ میرے ساتھ ساتھ چلتا رہتا ہے۔ مجھ سے چپکا رہتا ہے۔

''کتنی بار کہا ہے تم سے مجھے اکیلا چھوڑ دو''

پر نہیں مانتا ہے۔

''دیکھ' دیکھ میں آج تمہارے ساتھ کیا کرتا ہوں''۔

''یہ دیکھ.... یہ دیکھ''

یہ چپت.... 'یہ لات.... یہ مکا

اور لے.... اور لے

سڑک پر بھیڑ اکٹھا ہو رہی ہے۔

''پر آج میں تجھے مزا چکھاتا ہوں''

یہ لات.... یہ مکا.... اور یہ ٹھوکر بھی

سڑک پر بھیڑ اور بڑھ رہی ہے

کچھ لوگ ہنس رہے ہیں کچھ اس تماشے کا لطف اٹھا رہے ہیں۔

''کیوں نہ ہوں''۔

کیونکہ میں اب بیچ بازار' سر راہ اپنے سائے کے ساتھ گتھم گتھا ہوں۔

اور گوتم بدھ کی آنکھ سے آنسو ٹپک رہے ہیں۔ ☆☆

خارزارِ محبت

ہال میں ہنگامہ ہوا

کچھ لوگ جذباتی ہو کر کرسیاں توڑنے لگے تو کچھ لوگ سٹیج کی طرف بڑھنے کی کوشش کر رہے تھے تبھی کسی نے آواز دی۔

''ارے آگ لگا دو.... آگ''۔

ایک ڈیڑھ گھنٹہ پہلے اس ہال میں لوگ ایک ایک، دو دو کر کے جمع ہو رہے تھے اور یہ سب سٹیج ڈراما دیکھنے کے مشتاق تھے۔ انہیں اس بات کا اندازہ بھی نہیں تھا کہ کچھ دیر بعد یہ سب ہو گا۔

ڈیڑھ گھنٹہ پہلے

''حیرت کی بات ہے''

''کیا؟''

''اور نہیں تو کیا، بالکل حیرت کی بات ہی تو ہے''۔

''آخر کیا بھلا؟''

''ہم کتنی مدت سے ساتھ ہیں؟''

''ہاں..... ہیں تو''

''پر....''

''پر کیا؟''

''پر میں نے ابھی تک تمہارے کان نہیں دیکھے ہیں''۔

وہ حسبِ معمول یونانی وضع کا سکارف سر پر جمائے آئینے کے سامنے بیٹھی اپنے ایک گھنٹے کی مشاقانہ محنت کو فائنل میک اپ ٹچ دے رہی تھی اور ہنس بھی رہی تھی۔

''ہا۔ہا۔ہا....''

''کیسی باتیں کر رہے ہو..... مسیح!''اس نے پھرتی سے چلتے ہوئے ہاتھ کو روکا۔

''میری ہنسی رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی ہے مسیح..... یہ کیسی باتیں کر رہے ہو۔''

''تم ہنس رہی ہو اور مجھے عجیب شک نے گھیر لیا ہے''۔

''کس طرح کے شک نے گھیر لیا ہے؟''

''کہ.... کہ.... کہیں تم کن کٹی تو نہیں''

ہا.... ہا.... ہا... اب اس نے برش نیچے رکھ دیا اور اس کی طرف مُڑ گئی۔

''نہیں،ایسا کچھ بھی نہیں ہے''۔شیریں نے اپنی ہنسی پہ قابو پاتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی بول پڑی۔

''ہاں البتہ میرے ہاتھ ....''اس نے اپنے دودھیئے بھرے بھرے ہاتھوں کی طرف مایوسی سے دیکھا۔

''ہاتھوں کو کیا ہوا اچھے خاصے تو ہیں؟''

''نہیں میرا مطلب کہ یہ میرے ہاتھ عورتوں جیسے تو بالکل نہیں ....''وہ

اب بھی ہنس رہی تھی اور مسیح اسے دلچسپی سے دیکھنے لگا۔

ایک وقفے کے بعد

''او۔ مسیح''

''کتنی بار کہوں تمہیں''

''میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات نہ کیا کرو' مجھے اچھا نہیں لگتا''۔

''اچھا نہیں لگتا!.... چلو نہیں دیکھتا پر۔ اتنا تو بتادو کہ تمہیں اچھا کیا لگتا ہے؟''

''تم سے مطلب.... تمہیں کیوں بتاؤں؟''

اچھا' نا بتاؤ کم سے کم مجھ سے بات تو کر سکتی ہو' یا پھر تمہیں اس پر بھی اعتراض ہے؟''

''کون سی بات؟''

''کس طرح کی بات؟''

''بہت بولتے ہو تم مسیح' بہت بولتے ہو تم''

تبھی میک اپ روم میں ایک بندہ داخل ہوا اور مسیح نے ایک آہ بھری اور سگریٹ سلگا لیا۔

''چلئے جناب پردہ اٹھنے کی تیاری ہے''۔

''تم چلو ہم ابھی آتے ہیں''۔

''شیریں''

''ہوں''

''کیا؟''

''کیا تمہیں مجھ سے بات کرنا اچھا نہیں لگتا؟''

''سچ کہو.... کیا.... کیا تمہیں مجھ سے محبت نہیں؟..... کیا میں اتنا بُرا ہوں؟''سٹیج پر جانے سے پہلے ایک نظر مجھے دیکھ تو لو' تا کہ مجھے بھی کچھ سکون ملے''۔

شیریں کچھ غصہ ہوئی اور جھنجھلا کر بولی۔

''کتنی بار کہوں' مجھے یہ سب اچھا نہیں لگتا''۔

''شیریں ایک بار' صرف ایک بار' میرے دل کی بات سن تو لو''۔

پھر وہی بندہ آیا۔

''چلیے آ جایئے ٹائم ہو گیا ہے''۔

شیریں اپنے ساتھ بڑبڑائی ''پتا نہیں مجھے اس ڈرامے سے کب نجات ملے گی' ایک ہی پلے کرتے کرتے اب میں تھک چکی ہوں۔''

''کیوں.... کیوں اس دنیا میں ایک ہی کہانی لکھی گئی ہے؟''

''اور اس کہانی کا ایک ہی کردار نبھاتے نبھاتے میں اب کافی تنگ آ چکی ہوں''۔

''مسیح....''

''ہیں''

''مسیح''

''سن رہے ہو نا''؟

''میں اب یہ ڈراما' اس کا کردار کرتے کرتے اوب چکی ہوں' کیا واقعی تمام دنیا میں بس یہی ایک کہانی' یہی ایک پلے لکھا گیا ہے؟

''اور دیکھو نا' ان نامراد لوگوں کو.... یہ لوگ یہ ڈراما دیکھ دیکھ کے تھکتے بھی نہیں''۔

مسیح تم سن رہے ہونا؟''

''ہاں ہاں سن رہا ہوں اور تمہاری بات سے اتفاق بھی ہے، مگر.... مگر''۔

''شیریں تم بھول رہی ہو... بھول رہی ہو کہ یہ ڈراما اور اس کی یہ کہانی ہماری روایت اور ہمارے ثقافتی ورثے کا حصہ ہے اور اس ڈرامے کو لوگ نہ صرف عظیم مانتے ہیں بلکہ اس کے ساتھ اب ہم سب کی جذباتی وابستگی بھی ہے۔ میرا تو ماننا ہے یہ کہانی اب ہمارے عقیدے میں شامل ہو چکی ہے''۔

''اب تو لوگ یہ پلے دیکھنا بھی ایک....''

''خیر مجھے پتہ نہیں کہ دنیا میں کہیں اور کوئی کہانی لکھی بھی گئی ہے یا.... پر ہماری دنیا تو بس یہی ہے اور اتنی ہی ہے اور ہم سب اسی میں خوش ہیں۔ ویسے میں تمہیں کیوں سمجھا رہا ہوں؟''

تھوڑا توقف کے بعد۔

''تمہیں کچھ سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ ہم لوگ یہ کردار بہت دنوں سے سٹیج پر نبھاتے آ رہے ہیں۔ ہم سے پہلے بھی لوگوں نے یہ کردار نبھائے ہیں اور آئندہ بھی یوں ہی نبھاتے جائیں گے اور سب اسی میں خوش ہیں''۔

''خوش.... خوشی....'' شیریں نے مسیح کی بات کاٹتے ہوئے کہا ''اپنی خوشی کا تو سب کو خیال ہے پر.... میرا کیا.... میرا کیا؟''

''ویسے بھی اس کہانی میں اتنا کیا ہے؟''

''ایک سپاٹ سی کہانی ہی تو ہے!''

''پہلے سین میں''

تم دیوتاؤں سے آشیرواد لے کر مجھ سے ملنے آتے ہو اور کہتے ہو۔

''میں جنگ پر جا رہا ہوں''

اور جانے سے پہلے تم اپنی محبوبہ یعنی مجھ سے وعدہ کرتے ہو کہ ''میں واپس آؤں گا' ضرور آؤں گا صرف واپس ہی نہیں' بلکہ فتح یاب ہو کر لوٹوں گا۔''

''بس تم میرا انتظار کرنا اور اپنی ہمت بنائے رکھنا''

اور میں یعنی تمہاری محبوبہ کہتی ہوں۔

''میرے محبوب''

''میں تمہاری امانت ہوں''

''میں تمہارا انتظار کروں گی''

''ضرور کروں گی پر اگر تم نہیں لوٹے' تو میں تمہارے انتظار میں جان دے دوں گی''۔

دوسرے سین میں تم لوٹ آتے ہو۔

پر جب تم واپس لوٹتے ہو تو تم دیکھتے ہو کہ تمہاری محبوبہ کو کوئی اور اپنے ساتھ اس کی مرضی کے خلاف لے گیا ہے' تم بہت افسردہ ہو جاتے ہو پر تم ایک اور جنگ لڑتے ہو' اپنی محبوبہ کو واپس لانے کے لیے۔

تیسرے سین میں خوش قسمتی سے تم یہ جنگ بھی جیت لیتے ہو۔

چوتھے سین میں.... شیرین نے ایک لمبی سانس لیتے ہوئے کہا

چوتھے اور آخری سین میں

تمہارے..... تمہارے وہ مشہور مکالمے جو لوگوں نے کئی بار سنے ہیں اور بار بار سننا چاہتے ہیں۔

''دیوتاؤں کے آشیرواد سے مجھے کوئی نہیں ہرا سکتا پر میں تمہاری محبت میں

دل ہار بیٹھا ہوں''۔

''اب میں تمہیں واپس تو لے آیا ہوں پر.... ؟ پر میں تمہیں طاقت کے بل پرنہیں.... تمہیں اپنی سچی محبت سے پانا چاہتا ہوں اور اگر میرا عشق سچا ہے تو تم میرا ہاتھ ضرور تھام لوگی''۔

''اور ہاں''مسیح نے شیریں کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

پھر میں تمہارے قدموں میں گر کر تمہاری نیلی بڑی بڑی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنی محبت کی درخواست کرتا ہوں۔تم ہنسی خوشی میری درخواست قبول کرتی ہو اور یوں ہمارا کبھی نہ ختم ہونے والا....

''ہاں... ہاں ابدی ملاپ.... لافانی ملن ہو جاتا ہے''

اور پھر وہی نغمہ گونج اٹھتا ہے۔ جسے محبت کا نغمہ کہتے ہیں اور پردہ گرادیا جاتا ہے۔

اس بار مسیح نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا

''کیوں میں نے ٹھیک کہا نا؟''

شیریں پہلے کچھ مسکرائی اور پھر سنجیدہ ہو کر بولی

''کیوں یہی ایک کہانی لکھی گئی ہے؟''

''میں اب بالکل ہی اوب چکی ہوں''

جانتی ہوں اس کہانی میں ہمارے دیوتاؤں کا'پورو جوں کا ذکر ہے اسی لیے کہانی کے خلاف کوئی کچھ کہہ نہیں سکتا اور نا ہی اس میں کوئی تبدیلی آسکتی ہے اور ہاں اس سے انکار بھی ممکن نہیں ہے۔

''کریں بھی تو کیا کریں؟''مسیح نے کہا۔

''ہمارے یہاں بس' یہی ایک کہانی ہے' ہمارے آباواجداد نے بھی یہی کیا ہے ہم بھی یہی کررہے ہیں اور ہمارے بعد بھی جو لوگ آئیں گے وہ بھی یہی ناٹک کھیلیں گے''۔

''تماشائیوں کا بور ہونا یا ان کی اکتاہٹ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' وہ سالہا سال سے دیکھ رہے ہیں اور محظوظ ہو رہے ہیں''۔

تبھی مسیح نے شیریں کے چہرے پر چھائی اداسی بھانپ لی۔

''تم اتنی ملول کیوں ہو شیریں؟'' مسیح نے بے چین ہو کر پوچھا

''نہیں کچھ نہیں'' شیریں نے ٹال دیا۔

شیریں جب تیار ہو کر میک اپ روم سے نکلی اور سٹیج کی طرف بڑھنے لگی تو مسیح نے روک کر کہا۔

''شیریں تمہیں مجھ سے محبت نہیں تو نا سہی' پر مجھ پر ہمیشہ بھروسہ کر سکتی ہو''۔

پردہ اٹھا

تالیوں کی گونج

پہلا سین

دوسرا سین

تیسرا سین

چوتھا اور آخری سین

''میں تمہیں اس چنگل سے آزاد تو کر لے آیا' پر میں تمہیں سچی محبت سے پانا چاہتا ہوں''۔

''اب تم اپنی مرضی بتاؤ''

''تب تک میرا سر تمہارے قدموں میں جھکا رہے گا''۔
سٹیج کے پیچھے محبت کا نغمہ گانے والے گیت گانے کے لیے تیار ہونے لگے۔
سر جھکانے سے قبل مسیح نے شیریں کی نیلی موٹی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سچ میں ایک مجبور عاشق کی طرح دیکھا....
مسیح کے ایسے دیکھنے سے شیریں گھبرا گئی۔
مسیح شیریں کو کچھ عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا اور شیریں کو مسیح کا جسم بے جان سا لگا۔
اس سے پہلے وہ چیخ پڑتی مسیح نے اپنے جسم کو جنبش دی سارے ہال میں یکا یک سناٹا چھا گیا' ایک پل کو جیسے لوگوں نے اپنی سانسیں بھی روکے رکھیں البتہ دل زور سے دھک دھک کر رہے تھے۔
شیریں کو کچھ خیال نہیں رہا کہ وہ سٹیج پر اپنا کردار نبھا رہی ہے۔مسیح کی یہ اداکاری دیکھ کر بنا سوچے سمجھے وہ کہہ اٹھی۔
''پاگل ہو گئے ہو کیا' تم نے تو میری جان ہی نکال دی۔ مجھے لگا....؟''
''مجھے لگا.... کہ تم''
مسیح مسکرایا اور بولا
سچ مانو.... میں پاگل ہی تو ہوں۔ایک دم پاگل'.... تمہارا پاگل....''
''یقین نہیں آتا ہے نا.... لو دیکھ....''
اس کے ساتھ ہی مسیح نے آخری بار ہچکی لی۔

☆☆☆

اِس جہانِ خراب میں

یہ سبھی تارے نوچ ڈالوں۔
اس رات کو پاش پاش کر دوں۔

یہ سب.....

یہ سب خدا اور میرے بعد میرے اس کام کے گواہ ہیں جو میں ابھی ابھی کر کے لوٹ رہا ہوں۔

ایسا کام جو سب کی نظروں میں گناہ ہے، بہت بڑا گناہ۔

لیکن.....

میرے لیے تو صرف مجبوری ہے۔

گناہ بھی ایسا جو پہاڑوں سے بھی بھاری ہے بہت بھاری۔ مجھے لگ رہا ہے جیسے میرے کاندھوں پر دو پہاڑ رکھ دیئے گئے ہوں۔ پر اتنا بوجھ ہونے کے باوجود بھی پتہ نہیں میں کیسے استادہ ہوں اور چل رہا ہوں حالانکہ میرے قدم نہایت ہی بوجھل ہیں۔ ہر قدم اٹھانے کے بعد مجھے لگ رہا ہے جیسے میں دلدل میں دھنس رہا ہوں۔

ہر سو سناٹا ہے بے حد سناٹا۔ پر اتنا سناٹا ہونے کے باوجود بھی میں اپنے قدموں کی چاپ نہیں سن پا رہا ہوں۔ میں بہرہ بھی تو نہیں ہوں۔ رات کا پچھلا پہر

ہے اور بستی کے سارے لوگ سوئے پڑے ہیں۔ مجھے اپنے چلنے کی رفتار اور تیز کرنی ہوگی۔ مجھے سحر ہونے سے پہلے ہی واپس لوٹنا ہوگا کیونکہ گھر پر زینب انتظار کر رہی ہوگی۔ ابھی اس پر بھی غم کا یہ پہاڑ ٹوٹنا باقی ہے کیا پتا وہ یہ صدمہ برداشت کر پائے گی بھی یا نہیں۔ میں اُسے کیسے بتاؤں' کیسے سمجھاؤں' مجھے شبدوں کی جادوگری بھی تو نہیں آتی۔ ہوسکتا ہے وہ میرے چہرے کی حالت سے سب کچھ سمجھ جائے۔ اگر نہیں بھی سمجھی تو میں دھیرے دھیرے اسے سمجھا دوں گا' سمجھا دوں گا جو پریشانی ہم چند مہینوں سے جھیل رہے تھے میں نے وہ پریشانی.....

جس خوف' جس دہشت نے کئی دنوں سے ہماری نیند اُچاٹ کر رکھ دی تھی ہم اس خوف' اس دہشت سے نجات.....

کئی روز سے ہم ایک دوسرے سے کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن پتہ نہیں کیوں کچھ کہہ نہیں پا رہے تھے۔ صرف ایک دوسرے کا منہ تکتے رہتے تھے۔

پر ایک دن جب زینب کچھ زیادہ ہی پریشان ہوگئی تو مجھ سے پوچھ بیٹھی۔

جی اب کیا ہوگا۔

اور میں نے جھوٹا دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔

سب ٹھیک ہو جائے گا۔ گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔

پر.....

پر میں اسے کیسے بتاتا کہ میں خود اندر ہی اندر ڈرا ڈرا سا ہوں۔

دل دہلا دینے والی خبریں برابر آتی رہیں

آج پانچ سالہ بچی.....

سات سالہ بچی کے ساتھ.....

ایک دوشیزہ کواغوا کرلیا گیا اور پھر.....

پھر دہلی کے واقعہ نے سب کے ہوش ہی اڑا دیئے۔اس رات زینب اور میں پوری رات نہیں سو پائے صرف ایک دوسرے کو تکتے رہے۔خبروں میں کچھ یوں سنا تھا:

''ائر پورٹ سے آتے وقت ایک لڑکی کو چند غنڈوں نے اٹھالیا
اوراس کا گینگ ریپ کیا۔ان غنڈوں نے باری باری ایک ایک
کرکےاس کی آبروریزی کی''۔

اس واقعے نے لاکھوں کروڑوں لوگوں کے چہروں پرسوالیہ نشان چسپاں کردیئے۔ایک سوالیہ نشان مجھے زینب کے چہرے پربھی نظر آیا۔

وہ مجھ سے بہت کچھ کہنا چاہتی تھی۔پراسے کچھ بھی سوجھ نہیں رہا تھا۔

اُف.....!!

اُف غم کے وقت یہ راستہ طویل،بہت طویل کیوں ہو جاتا ہے۔آتے وقت یہ راستہ اتنا لمبا تو نہ تھا اور نا ہی مجھے یہاں آنے میں اتنا وقت لگا تھا۔میں بے حد افسردہ دل ہوں اور پریشان۔پر پتہ نہیں ایسی افسردگی اور پریشان حالت میں بھی میں گھر کی اور کیسے جارہا ہوں۔میں ذرّہ بھر بھی راہ نہیں بھٹکا۔پتہ نہیں میرے حواس کو کس چیز کی رہنمائی حاصل ہے۔مجھے تو تیز اور تیز چلنا ہوگا۔

ارے.....ارے وہ.....وہ میرا گھر رہا اور ابھی سحر بھی نہیں ہوئی پھر گھر کا دروازہ کھلا اور وہ طوفان کی طرح اندر گھس آیا۔زینب اسے دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور پریشانی کی حالت میں جلدی جلدی پوچھنے لگی،اس کے حلق سے الفاظ ٹھیک سے

نہیں نکل پا رہے تھے۔

ک..... کہاں..... کہاں تھے آپ۔اس طرح..... اچانک کہاں غائب ہو گئے تھے۔اس طرح بن بتائے آپ تو کہیں نہیں جاتے' کیا ہوا۔لِلّٰہ بتایئے نا کیا ہوا۔آپ کی آنکھوں سے عجیب وحشت ٹپک رہی ہے۔آپ کے بال بکھرے ہوئے ہیں۔سارا بدن پسینے سے شرابور ہے۔لِلّٰہ بتایئے نا کیا ہوا۔یہ پاگلوں سی حالت کا کیا مطلب ہے۔کچھ تو بتایئے۔

میں.....

میں نے اسے.....

میں نے اُسے نہیں مارا۔

بھلا میں اسے کیوں مارتا۔

اس کا آخر کیا قصور تھا۔

اگر اس کو مارنا ہی ہوتا تو میں اسے.....

تو میں اس کا گلا گھونٹ دیتا یا پھر اس سے زہر دے دیتا۔

مگر نہیں۔

بالکل نہیں۔

مجھے اسے نہیں مارنا تھا۔بلکہ مجھے تو صرف اسے محفوظ کر لینا تھا۔

محفوظ!

ہمارے سماج میں گھومتے پھرتے چاروں اور انسانوں کا روپ دھارن کیے ہوئے ان بھیڑیوں سے' ان درندوں سے جو کل جا کر اس کی بوٹی بوٹی نوچ ڈالتے' اس کی عزت' اس کی آبرو ریزہ ریزہ کرتے۔اسے رسوائی اور شرمساری کی زندگی بسر

کرنے پر مجبور کرتے۔

اسی لیے.....

سنو زینب تم سن رہی ہونا۔

زمین سخت تھی۔

بہت سخت' سنگلاخ۔

پر اسے ہار ماننی ہی پڑی۔ ایک بار' دو بار' کئی بار میں نے وار کیے اور آخرکار زمین کا سینہ چاک کر کے گڑھا کھود ہی لیا۔ پتہ نہیں اتنی سخت زمین میں' میں اپنے قد کے برابر کا گھڑا کھودنے میں کیسے کامیاب ہوا۔ میں بہت تھک گیا لیکن جب وہی خوف' وہی دہشت مجھ میں سرایت کرنے لگتی تو میں پھر اپنی پوری طاقت سے گڑھا کھودنے لگتا۔

وہ.....

وہ مجھے گھور رہی تھی۔ برابر گھور رہی تھی اور جیسے اپنی معصوم نگاہوں سے مجھ سے کئی سوال پوچھ رہی ہو۔

کیوں

آخر کیوں

آپ کیوں ایسا کر رہے ہیں۔

میں محشر میں آپ کا دامن پکڑ کر ضرور پوچھوں گی۔

آخر میرا کیا قصور تھا۔

میں اسے نظروں ہی نظروں میں سمجھا رہا تھا۔

نہیں.....

نہیں میری لختِ جگر۔

میری نورِ چشم، تمہارا کوئی قصور نہیں، تمہاری کوئی خطا نہیں۔ بس تمہارا ابو مجبور ہے۔ بہت مجبور۔

اور کوئی جگہ بھی تو نہیں جہاں میں تمہیں محفوظ رکھ سکوں۔ درندوں کی اس بستی میں آخر تمہیں کہاں چھپاؤں۔

کہاں چھپاؤں۔

پھر میں نے اس سے گود میں اٹھایا۔ اسے بے تحاشہ بوسے دیئے اور.....

ہاں.....!!

ہاں زینب پھر۔ پھر میں نے اس نور کو جس کی روشنی سے ہمارا گھر پچھلے تین سال سے روشن تھا اُسے محفوظ کر لیا۔

ہاں ہاں میں نے اپنی نور کو دفنا دیا..... زندہ!!

زندہ دفنا دیا اور یوں اُن بھیڑیوں اور درندوں کو شکست دے دی جو ہر وقت گھات لگائے بیٹھے ہوئے ہیں۔

وہ بولے جا رہا تھا، پر اُس کی بیوی زینب۔ کب کی غش کھا کر گری پڑی تھی.....۔

☆☆☆

خالی دامانِ حیات

''کون؟''

''میں''

''میں کون؟''

''ارے میں ہوں''

تھوڑی خاموشی کے بعد

''اوووو تم''

'' کیسے فون کیا؟''

روکھا لہجہ

''وہ.... وہ.... بات کرنی تھی''

'' کیا بات' کون سی بات' اتنی مدت کے بعد! اتنے برسوں کے بعد.... اب کون سی بات کرنی ہے؟''

''وہ....''

کھانسی کا ایک ہلکا سا وقفہ

''وہ کیا ہے کہ''

''ہاں کیا.... پیسے چاہیے؟۔ صاف صاف کہو' خیر کوئی نہیں' اپنا اکونٹ نمبر

بولو،میں ٹرانسفر کردوں گی''۔

''نہیں نہیں.... پیسے نہیں چاہیے''

''تو پھر؟''

''وہ.... وہ تم سے بات کرنی ہے''۔

''ہاں۔کہو میں سن رہی ہوں۔پر جلدی کہو مجھے اور بھی بہت سارے کام ہیں''۔سرد مہری سے جواب۔

''نہیں ایسے نہیں کہہ پاؤں گا''۔

''پھر؟''

''وہ....''

''وہ ملنا ہے تم سے''

''ملنا ہے؟''اونچی آواز گونجی

''ممکن نہیں''

''میرا مطلب۔مجھے فرصت نہیں ہے''

''پلیز... میں تمہارا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔میں سمجھ سکتا ہوں۔تمہیں بھی۔تمہاری مجبوریاں بھی''۔

کھانسی کا ایک اور وقفہ

پھر خاموشی

ذرا وقفے کے بعد

''کہاں سے بول رہے ہو؟''

''پبلک ٹیلی فون بوتھ سے''

''کیوں اپنا فون نہیں ہے؟''

''نہیں.....''

''کیوں؟''

''بس نہیں ہے''

''بڑی مشکل سے تمہارا نمبر ڈھونڈا ہے'' پھر کچھ خاموشی کے بعد۔

''یہاں کب سے ہو؟''

''بس کچھ دن سے..... کچھ دن سے تمہارے شہر میں ہوں''۔

''کوئی آفس کا کام تھا؟''

نہیں.... وہ آفس.... آفس کا کام نہیں تھا' میں اب کام نہیں کرتا''۔

مطلب' ریٹائر ہوگئے ہو!'' پر ابھی تو تمہارے ریٹائرمنٹ میں ٹائم ہے شاید''۔

''ہاں ابھی ٹائم تھا''

''تو پھر؟''

''وہ.... خیر کوئی اور بات کریں؟''

''چھوڑ دی؟''

''نہیں..... چھوڑی نہیں....''

''تو پھر؟''

''نکال دیا گیا''۔

''کیوں کوئی غبن یا فراڈ کیا تھا؟''

''نہیں تو.... ایسا کیوں کروں گا بھلا؟''

''نہیں وہ میں نے سوچا تم ہمیشہ تنگ دست رہتے ہو۔تمہیں ہر وقت روپے پیسوں کی ضرورت رہتی ہے اسی لیے کہا

''تم اچھی طرح جانتی ہو۔بھلے ہی میرا ہاتھ کتنا ہی تنگ رہا ہو۔پر... پر میں کبھی ایسا ویسا کام نہیں کرتا جس کے کرنے پر شرمندگی ہو'۔

''پھر یہاں کیسے؟''

بس یوں ہی گھومنے آیا تھا''۔

''گھومنے! یا پھر کسی بہانے مجھ سے.... سچ کہو؟''

پھر دونوں اطراف خاموشی

''ایڈمٹ تھا''

''کہاں؟''

''یہ۔یہاں سٹی ہسپتال میں''

''بیمار تھے؟''

''ہاں''۔

''کیا بیماری تھی؟''

''کچھ نہیں بس تھوڑی سی کمزوری اور... خیر رہنے دو''

''کب ڈسچارج ملا؟''

''سچ کہوں؟''

''ہاں بالکل تمہیں معلوم ہے مجھے جھوٹ سے نفرت ہے''

''ڈسچارج ملا نہیں!''

''پھر؟''

''بھاگ نکلا''

''ہیں!.... ''حسب عادت.... طنز بھرا لہجہ

''ٹھیک کہا''

''سچ پوچھو تو مجھے کوفت ہو رہی تھی۔ ہسپتال میں ساتھ مریضوں سے وہاں کے ڈاکٹروں سے' سٹاف سے' وہاں کی بو سے..... اسی لیے.... بھاگ کھڑا ہوا' پیر کانپنے لگے''

''کہاں انتظار کروں؟''

''نہیں آ سکتی۔ وہ ڈرائیور گاڑی ٹھیک کرانے کے لیے گیا ہے''

''پر.... پر مجھے ضروری بات کرنی ہے''

''میں نے کہا نا.... نہیں آ سکتی''

بعد میں کبھی ملیں گے تو بات کر لیں گے.... ''ٹالتے ہوئے

''پر....!''

''پر کیا؟''

''پر.... میرے پاس وقت نہیں....''

کھانسی کا ایک اور زوردار جھٹکا پھر کچھ خاموشی....

دم سنبھالتے ہی... ''میں تمہارا وہی انتظار کروں گا''۔

تھوڑی توقف کے بعد

''جہاں ہم ملا کرتے تھے۔ مجھے نہیں پتا وہ جگہ ابھی ... ویسی ہی ہے یا پھر.... میرا مطلب ہے۔ وہ ریستورنٹ ہے بھی یا نہیں۔ پر میں اسی عمارت کے سامنے تمہارا انتظار کروں گا.... بس تمہارا انتظار کروں گا۔ آؤ گی نا؟''

''میرے پاس فون نہیں ہے۔ پر مجھے امید ہے ہم دونوں کو ایک دوسرے کو پہچاننے میں دقت نہیں ہوگی خاص کر مجھے .... میں تصور کرسکتا ہوں۔ کہ تم اب کیسی دکھتی ہوگی''۔

''اچھا رکھتی ہوں....'' بات کاٹتے ہوئے۔

''کیوں؟''

''وہ.... وہ نمّو آتی ہوگی''

''نمّو....؟''

''ہاں میری بیٹی''۔

''اچھا بیٹی ہے؟''

''ہاں اور ایک بیٹا بھی، دونوں ماشاءاللہ اب جوان ہوگئے ہیں''۔

''اور تمہارے؟''

''کیا؟''

''تمہارے کتنے بچے ہیں؟''

خاموشی.....

سانس پھول رہی ہے اور صرف اسی کی آواز آرہی ہے

کچھ وقفہ بعد

''نہیں ہیں.... شادی نہیں کی میں نے''

''کیا؟''

''ہاں''

''او ہو عین اپنی طبیعت کے مطابق۔! ویسے برا نہ مانو تو ایک بات کہوں؟''

''ہاں کہو''

''تم سے کوئی شادی کر بھی نہیں سکتی تھی''۔

طنزیہ مسکراہٹ

پھر ایک اور خاموشی کا وقفہ

''شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو، تم سے بہتر مجھے کوئی سمجھ نہیں سکتا ہے، کوئی جان نہیں سکتا۔ میرا یقین مانو میں اتنا کم عقل بھی نہیں کہ تمہیں کوئی تکلیف پہنچاؤں پر۔ مجبوری ہے.... بات بہت اہم ہے۔ بے حد ضروری....''

پھر شدید کھانسی کا دورہ

''بس جلدی آجانا.... ہیلو.... ہیلو....'' فون کٹ جانے کی آواز۔

وہ ٹیلی فون بوتھ چھوڑ کر آٹو رکشا میں بیٹھا اور چل پڑا۔ ٹیلی فون بوتھ ہی کیوں۔ وہ ہسپتال ہی کیوں بیڈ، انجکشن، ڈرپ کی بوتلیں ہی کیوں، وہ اس کے علاوہ اور بھی بہت کچھ، بہت کچھ چھوڑ آیا تھا۔ خواب، ارمان، خواہشیں، امیدیں خوشیاں، ہنسی، راحتیں، چاہتیں، اپنے، پرائے.... بہت کچھ چھوڑ آیا تھا۔

ہلکی چادر نما شال لپیٹ کر پھٹی پرانی گھسی ہوئی چپل، بنا شیو کیا ہوا چہرہ وقت کی خاک ماتھے پر ملے، ایک ہارا ہوا سپاہی جیسے، ایک مات کھایا ہوا جواری جیسے، تھکا ہوا مسافر بہت کچھ بدلا بدلا سا بہت زیادہ تھکا تھکا سا.... وہ سچ میں پیچھے بہت کچھ چھوڑ آیا تھا۔ اس کی آنکھیں آبدیدہ اور ویران تھیں، آٹو رکشا میں بیٹھے اس شہر کو دیکھ رہا تھا۔ جہاں اس نے جوانی گزاری تھی۔ زندگی کے خوشیوں بھرے سال گزارے تھے۔ بہت ساری آوارہ گردیاں کیں تھیں۔ تب کہیں ایک دن اس کی اپنی سچی محبت سے ملاقات ہوئی۔ پر اس کی قسمت میں وہ محبت نہیں تھی۔ بلکہ اس کی جدائی

اور اس کا غم نصیب میں تھا اور پھر وہ ناکام ہو کر بھاگ گیا اس شہر سے، اپنوں سے یہاں تک کہ اپنی محبت سے بھی..... آج جب وہ برسوں بعد واپس لوٹا تو.....

اتنا سب کچھ ہوا، کتنا وقت گزرا.... اور میں.....

اس کے دل سے ایک ہوک سی اٹھی۔

چوکیدار نے مطلع کیا کہ کوئی صاحب ملنا چاہتے ہیں۔

اس کی ہمت یہاں تک چلا آیا! بڑا دم بھرتا تھا کہ میری عزت کا بڑا خیال ہے۔ میری بڑی پروا کرتا ہے۔ پر اس کی ہمت تو دیکھو۔ کل ملنے کیا نہیں گئی، آج گھر چلا آیا.... ایک لمحے کو بھی یہ نہیں سوچا کہ میں اپنے شوہر سے کیا کہوں گی!

ہمیشہ کی طرح لاپرواہ

پر جلدی ہی اس نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے چوکیدار سے کہا

''جاؤ ان کو بٹھاؤ۔ میں ابھی آتی ہوں''۔

''جی بتائیے''۔

یہ دیکھ کر کہ یہ وہ نہیں کوئی اور ہے اس نے اطمینان کا سانس لیا۔

''میڈم کل شام سے کئی بار فون کیے پر کوئی ریسپانس نہ ملا''۔

''اچھا تو وہ آپ کا نمبر تھا میں کسی اور کا نمبر سمجھی تھی!'' راحت کی لمبی سانس لے کر۔

''خیر بتایئے میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں؟'' اب وہ نارمل ہو چکی تھی۔

''کل سڑک پر ملی نامعلوم لاش سے، یہ آپ کے موبائل نمبر کی پرچی ملی ہے''

''کیا آپ لاش کی شناخت کرنے کے لیے ہمارے ساتھ آئیں گی؟''

☆☆☆

کرائیسس

دروازے پر دستک لگا تار ہو رہی تھی جب اس کی آنکھ کھلی۔

وہ اٹھا اور آنکھیں ملتے ہوئے دروازہ کھولا' دیکھا باہر کوئی نہیں تھا۔

ایک بار بس ایک بار مجھے یہ روز روز دستک دینے والا' میری نیندیں خراب کرنے والا مل جائے تو مزہ چکھا دوں۔

ویسے بھی میں آج رات بھر سویا نہ تھا۔ ابھی ابھی تو میری آنکھ لگی تھی۔

وہ خود کے ساتھ بڑ بڑایا اور پھر واپس لیٹ گیا اور اپنے ناخن سے دیوار کو کھرچنے لگا' جیسے دیوار میں سوراخ کرنے لگا ہو۔ وہ کل کے غیر یقینی اور حیرت انگیز واقعہ کے بارے میں سوچنے لگا۔ جس نے اس کی نیند اُچاٹ کر رکھ دی۔ پھر دھیرے دھیرے اس کی سوچ کے دائرے بڑھنے لگے اور اسے اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر لیا ہوا وہ فیصلہ یاد آنے لگا جو انہوں نے لگ بھگ مہینے بھر پہلے لیا تھا۔

.....ایک مہینہ پہلے.....

ایک سینما ہال سے باہر آتے ہوئے وہ دوستوں سے کہنے لگا۔

کب تک! آخر کب تک ہم یہ بکواس اور فضول فلمیں دیکھتے رہیں گے۔

میں تو اب اُوب چکا ہوں۔

سچ کہتے ہو مانو۔

دوسرے دوست نے تائید کی۔ان میں فحاشی اور غنڈہ گردی کے سوا بھلا ہوتا کیا ہے۔تعجب ہے ان میں دکھائے جانے والے کرداروں میں جو سب سے بڑا غنڈہ ہوتا ہے' وہی فلم کا ہیرو ہوتا ہے۔کہانی کا تو سرے سے ہی پتہ ہی نہیں ہوتا۔

سب دوستوں نے اتفاق کیا

مانو کہنے لگا بس اب ہمیں اپنے ویک اینڈس کو مزید خراب نہیں کرنا چاہیے۔ ہر ویک اینڈ پر ہمیں کچھ نیا کرنا چاہیے۔

سب دوستوں نے مانو کے مشورے کا خیر مقدم کیا۔

پھر چاروں دوست اگلے ویک اینڈ پر سیر وتفریح کے لیے پارک میں پہنچے۔ پارک میں زیادہ تر عورتیں اور بچے تھے۔بچے کھیل کود میں خوش تھے اور عورتیں ہنستی مسکراتی گوسِپ کرتی نظر آرہی تھیں۔ہفتے بھر کے کمپنی کے تھکا دینے والے کام کے بعد انہیں پارک میں آکر سکون سا مل گیا۔مانو اور اس کے دوست نرم نرم گھاس پر لیٹ گئے اور گپے ہانکنے لگے۔

ٹیں.....ٹیں..... مسیج الرٹ

مانو کے موبائیل پر نیوز الرٹ مسیج آئی اس نے جیب سے موبائیل نکالا۔

''غزہ میں مرنے والوں کی تعداد دو ہزار سے اوپر مرنے والوں میں زیادہ تر عورتیں اور بچے شامل''۔

مانو کا چہرہ اُتر گیا۔

وہ اداس نظروں سے پارک میں کھیل رہے بچوں کو دیکھنے لگا۔ان کے پیچھے دوڑتی بھاگتی ہوئی ان بچوں کو آوازیں دیتی ہوئی رنگ بہ رنگ ملبوسات میں سجی عورتوں یا ماؤں کو گھورنے لگا اور پھر اپنے ساتھ دہرانے لگا۔

کیا قصور، آخر ان بچوں اور عورتوں کا کیا قصور رہا ہوگا جنہیں بے رحمی سے مارا گیا۔

ارے کیا ہوا؟ دوستوں نے پوچھا؟ تو اس نے اپنا موبائیل فون آگے کر دیا سب نے مسیج پڑھی اور اپنے اپنے سیل فونز نکالے فیس بک اکونٹ پر لاگ اِن کیا اور اپنا اپنا احتجاج درج کیا۔

مانو تم اپنا احتجاج ثبت نہیں کرو گے۔ اس نے اپنا سر نفی میں ہلایا۔

سبھی دوست پارک سے باہر آئے اور تھوڑی ہی دیر میں سب بھول گئے۔ لیکن مانو ابھی بھی اداس تھا۔ اس نے دوستوں سے پیچھا چھڑایا اور واپس فلیٹ میں آیا۔ شیڈول کے مطابق اگلی سیٹر ڈے کو سب دوستوں نے ایک ساتھ مل کر کھانا کھانے کا پروگرام بنایا۔ ایک اچھے سے ریسٹورنٹ کا انتخاب کیا گیا اور سب دوست کھانا کھانے کے لیے چلے گئے۔

چکن منچورین اور نان وغیرہ آرڈر کر کے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ مانو نے ان باتوں میں دلچسپی نہ لیتے ہوئے ٹیبل پر رکھا اخبار اٹھایا اور ورق گردانی کرنے لگا۔

کالی اور نہایت کمزور جسم والی عورت بچے کو دودھ پلا رہی تھی۔

اخبار میں کچھ ایسی ہی تصویر چھپی تھی۔

اس سوکھی چھاتی میں سے دودھ کہاں سے نکلے گا۔ یہ بچہ پھر بھی پتہ نہیں کیوں ماں کی چھاتی چوس رہا ہے۔ اُف یہ بچہ بھی کتنا کمزور ہے۔ اس کی پسلیاں ایک ایک کر کے گنی جا سکتی ہیں۔ مگر اس کا پیٹ غبارے کی طرح پھولا ہوا ہے۔ ماں بچہ اتنے کمزور جیسے دو بڑی چھوٹی سوکھی ٹہنیاں ہوں۔ اخبار میں چھپی اس تصویر کے نیچے

لکھا تھا:

''افریقہ کے کچھ دور دراز علاقوں میں غذا کی قلت کے باعث لوگ طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا''۔

(Mal Nutrition)۔

ایک اچھی خوشبو نتھوں سے گذر کر مانو کے معدے تک سرائیت کر گئی۔ اس کے سامنے لذیز کھانا رکھا ہوا تھا۔ دوستوں نے کہا کب شروع کروگے۔ کھاؤ ورنہ کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا۔

نہیں دوستو بھوک نہیں ہے۔

ارے واہ! ابھی ابھی تو کہہ رہا تھا ساتھ مل کر کھانا کھانے کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔ اچانک سے کیا ہو گیا۔

بس میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔

مانو دوستوں کو وہی چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا۔

اگلے ہفتے ایک دوست نے انہیں پینٹنگ ایگزیبیشن کی خبر سنادی۔ سبھی مل کر ایگزیبیشن دیکھنے کے لیے چلے گئے۔ سنتور کی دھیمی دھیمی سُریلی دُھن بج رہی تھی۔ ایک لمبے سے ہال میں اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ پینٹنگ ایگزیبیشن کا لطف اٹھارہے تھے۔ مانو کے ساتھ آئے ہوئے دوست بھی دیواروں پرٹنگی پینٹنگس کو دیکھنے میں محو ہو گئے اور مصوروں کو داد تحسین دینے لگے ایک پینٹنگ کو دیکھ کر مانو کھو گیا اور کچھ یاد کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

یہ سب کہیں دیکھا ہوا ہے۔

پینٹنگ میں ایک دریا دکھایا گیا تھا' جس کے بہتے ہوئے پانی میں سے چند

ہاتھ پانی سے باہر کر کے دکھائے گئے تھے، جیسے وہ خود کو بچانے کی کوشش کر رہے ہوں یا پھر کسی کی مدد تلاش کر رہے ہوں۔

ہاں ہاں یاد آیا۔ مانو چلانے لگا۔

سب لوگ اس کی طرف عجیب نظروں سے دیکھنے لگے۔

ہاں یاد آیا میں نے نیوز میں دیکھا تھا جب کشمیر میں سیلاب آیا تھا اور گھاٹی کا بڑا شہر سمندر میں تبدیل ہوا تھا تب اسی طرح بالکل اسی طرح لوگ ہاتھ اٹھائے ہوئے نظر آ رہے تھے خود کو..... بچانے کے لیے..... مدد مانگنے کے لیے۔

مانو کے دوست پہلے تو حیران ہوئے پھر لپکے اور مانو کو ہال سے باہر لے آئے۔

کیا کرتے ہو مانو سبھی لوگ گھور رہے تھے۔ یہ گھاٹی بیچ میں کہاں سے آئی۔

میری بات مان لو یارو۔ اُن مصیبت زدہ لوگوں کا منظر بالکل ایسا ہی تھا۔ ہر طرف پانی ہی پانی اور..... اور وہ اپنے گھروں کی چھتوں پر بے یارو مددگار ایسے ہی ہاتھ اٹھائے پکار..... بس مدد کے لیے پکار رہے تھے۔

رہنے دو اب چلتے ہیں ایک اور دوست نے بات کاٹ کر کہا۔

مانو اب نیند نہ آنے کی وجہ سے ان سبھی واقعات کو ایک ایک کر کے یاد کر رہا تھا۔ پھر اسے کل کا واقعہ بھی یاد آیا۔

جب ایک سُریلی دھن اس کے سل فون پر بجی۔

ہیلو مانو یار کہاں ہو آج ہمیں آور ہیری ٹیج میوزیم (Our Heritage Museum) جانا ہے۔ یاد ہے نا۔

ہاں مجھے یاد ہے۔

پھر سبھی دوست میوزیم چلے گئے وہاں پر نادر و نایاب چیزیں، پرانے زمانے کے ملبوسات، زیورات، سکے، راجہ مہاراجاؤں کی اشیاء، جنگ اور روزمرہ کی زندگی میں کام آنے والی چیزیں دیکھیں۔ سب دوست حیران ہو گئے اور پرانے وقت پر رشک کرنے لگے۔ انہی چیزوں کو دیکھتے دیکھتے جب مانو آگے بڑا تو اس نے دیکھا ایک شیشے کے بڑے سے (گھر) میں کسی فن کار کا بنایا ہوا ایک مٹی کا مجسمہ، جو زانوں کو سمیٹ کر ان پہ بازو رکھے ہوئے اور سر کو نیچے جھکائے تھا، بالکل جیسے کوئی شخص کچھ سوچ رہا ہو۔ مانو اس کو گھورتا رہا اور پھر گھورتا ہی رہا۔

ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ یہ مجسمہ کچھ سوچ رہا ہے۔

نہیں..... نہیں..... یہ تو مٹی کا بنا ہوا بالکل بے جان پُتلا ہے۔

پر..... پر..... یہ کچھ سوچ رہا ہے۔

یہ ممکن نہیں۔ ہرگز ممکن نہیں۔

مانو اپنے اندر اٹھ رہے عجیب و غریب سوالوں کے طوفان کو خاموش کرنے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔

پھر اچانک دوستوں سے کہنے لگا۔ دیکھو یہ مجسمہ کچھ سوچ رہا ہے۔

ارے کیا بکواس کر رہے ہو مانو۔ ایسا مذاق کرنا اچھی بات نہیں، خاموش رہو۔

جب مانو نہ مانا تو سب دوست اُسے میوزیم سے باہر لے آئے اور ہنسنے لگے۔ مگر مانو اپنی بات پر ڈٹا رہا۔

پھر مانو نے کروٹ بدلی۔ اُف میرا سر درد سے پھٹا جا رہا ہے۔ اس کل کے واقعے نے میری نیند ہی اُچاٹ کر رکھ دی۔ اس نے دیوار کو کھرچنا بند کر دیا اور اٹھ کر سر درد کی دوائی ڈھونڈنے لگا۔ دوائی لینے کے بعد وہ خود سے بڑبڑایا۔ کسی نے بھی

میری بات کا یقین نہ کیا میں اپنا شک ضرور دور کرتا اگر میرے دوست مجھے باہر نہ لے آتے۔

اُس نے ایک نظر کمرے میں بکھری پڑی بے ترتیب چیزوں پر ڈالی پھر گھڑی کی طرف دیکھا۔ ابھی تو صرف دس ہی بجے ہیں۔ کیوں نہ میوزیم جاؤں اور اپنی یہ کوفت مٹا دوں۔

او نو! آج تو سنڈے ہے میوزیم بند ہوگا۔

تو کیا ہوا۔ مانو نے خود کو سمجھایا۔ میں کوئی بہانہ بنا کے اندر چلا جاؤں گا اور اپنا شک دور کروں گا۔ ایسی تذبذب کی حالت میں رہا تو میرے دماغ کی نسیں پھٹ جائیں گی۔

تھوڑی دیر بعد مانو آور ہیری ٹیج میوزیم (Our Heritage Museum) کے گیٹ کے باہر کھڑا تھا اور سیکورٹی گارڈ کو سمجھا رہا تھا۔

ارے بھیا۔ بس دو منٹ میں ابھی واپس آیا۔ وہ کیا ہے کہ کل میرا ایک بیگ اندر ہی رہ گیا..... لیکن صاحب میری نوکری کا سوال ہے۔

میں یقین دلاتا ہوں بس یوں گیا اور یوں آیا۔ اندر جاتے ہوئے اور واپسی پر بھی تو میری تلاشی لے لینا۔ پورے میوزیم میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ مانو اپنے قدموں کی چاپ خود ہی سُن رہا تھا۔ کاریڈور میں چلتے چلتے اس کا دل زوروں سے دھڑک رہا تھا۔ پھر وہ اس شیشے کے (گھر) کے قریب پہنچا۔ اسے لگا واقعی مجسمہ اپنے سر کو نیچے کیے ہوئے کچھ سوچ رہا ہے۔

ارے بتا دو وہ لرزتی زبان سے مجسمے سے پوچھنے لگا۔

ک..... کیا؟..... کیا؟..... سوچ رہے ہو۔ بتاؤ نا آخر کیا سوچ

رہے ہو۔

اپنے بارے میں یا پھراس دنیا کے بارے میں، تمہیں غمِ ہستی ہے یا پھرغمِ جہاں خود کے بارے میں سوچ رہے ہو یا پھر ہم جیسے خراب حالوں کے بارے میں۔آخرتمہاری سوچ کا مرکز کیا ہے۔خدا، انسان، مذہب یا سیاست۔؟

بتاؤنا آخر کیا سوچ رہے ہو۔کیا سوچ رہے ہو۔

اُس جنگ سے بھی زیادہ بھیانک دہشت کے بارے میں جو ہمارے اندر ہے یا اس بارود کے ڈھیر کے بارے میں جس پر ہم سب بیٹھے ہوئے ہیں اور جو کبھی بھی پھٹ سکتا ہے یا پھر 9/11 یوکرین، عراق یا برما کے بارے میں یا Ebola کی جیسی مہلک بیماری کے بارے میں جس کی موت سے موت بھی کانپ اٹھتی ہے۔اُن بے بس کمزور دوشیزاؤں کے بارے میں جنہیں ہوس کا شکار بنایا جاتا ہے یا پھراُن سادہ طبیعت لوگوں کے بارے میں جنہیں مذہب کے نام پرلڑوایا جاتا ہے۔غزہ میں مارے جانے والے بے گناہوں کے بارے میں یا پھر کشمیریوں کی بدنصیبی کے بارے میں۔یا پھر موت کے اُن سایوں کے بارے میں جو ہمارے اوپر گلوبل وارمنگ، سیکولونز، یا سونامی کی صورت میں منڈلا رہے ہیں۔بتاؤنا آخر کیا سوچ رہے ہو۔دیکھو بتادؤورنہ..... ورنہ میں..... یہ کہہ کر مانو نے لکڑی کا بنا ہوا قدیم زمانے کا ایک شمع دان اٹھایا اوراورشیشے کے (گھر) پرزور سے دے مارا۔شیشہ چکنا چور ہوگیا دفعتاً میوزیم کے سارے سائرن بج اٹھے۔میوزیم کی حفاظت پر مامور سبھی گارڈ دوڑتے ہوئے اندرآ گئے۔پکڑلو ' پکڑلواُس چورکوایک سیکورٹی گارڈ نے دوسرے ساتھیوں کو چلاتے ہوئے ہدایت دی اورانہوں نے مانوکو پکڑلیا۔

چھوڑدو..... چھوڑدو..... مجھے..... ' مجھےاس سے کچھ پوچھنا ہے۔

مانو خود کو چھڑانے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔
پھر اچانک مانو چلانے لگا' زور زور سے قہقہے مارنے لگا۔
دیکھو..... دیکھو..... ہا ہا ہا.....
سیکورٹی گارڈ اس کو گھسیٹ کر لے جا رہے تھے پر مانو نے دیکھا مجسمے میں دھیرے دھیرے حرکت ہو رہی ہے اور مجسمہ اپنا سر دھیرے دھیرے اوپر اُٹھا رہا ہے۔

☆☆☆

ایک لیکھک کی موت

پو پھٹتے ہی جب رات کی چادر میں چھید ہونے شروع ہو گئے تب اس کی آنکھ کھلی اور اس کی نظر کمرے کی دیوار پر پڑی۔ سفید رنگ سے پوتی دیوار پر اس نے جگہ جگہ اور چپے چپے پر پنسل سے کہانیوں کے نام، کرداروں کے نام اور مکالمے لکھے تھے۔ کسی کسی جگہ اس کی کہانیوں کے پسندیدہ جملے بھی رقم تھے اور کہیں ایک آدھ شعر بھی لکھا تھا۔

اسے بے حد کمزوری محسوس ہو رہی تھی اور وہ اس کمزوری کی وجہ سے کروٹ بدلنے کی سکت کھو چکا تھا۔ یہ ساری کمزوری لگاتار تین دن سے بھوکے رہنے کی وجہ سے تھی۔ وہ سمجھ ہی نہ سکا کہ وہ نیند سے جاگ اٹھا یا پھر بے ہوشی کے عالم سے ہوش میں آ گیا ہے اور دوسرے ہی لمحے اس کی آنکھیں پھر بوجھل ہو گئیں۔ پھر جب دوبارہ اس کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا تمام کمرے میں دھوپ اپنا ڈھیرا جمائے بیٹھی تھی۔ کیونکہ کھڑکیوں پر پردے نہیں لگے تھے۔ وہ تو اس نے چند روز پہلے مالک مکان سے یہ جھوٹ کہہ کر کہ ''یہ لونڈری میں دھونے کے لیے دینے ہیں'' بیچ دیئے تھے اور ایک دن کی روٹی کا انتظام کیا تھا۔ گھڑی نہ ہونے کے کارن اسے وقت کا کوئی پتہ نہ تھا۔ پر اندازے سے اُسے لگا شاید دوپہر ہو گئی۔ دھوپ سے چمکی ہوئی ایک گرم دوپہر۔ اُس کا تمام جسم پسینے سے شرابور تھا اور وہ یہ فیصلہ کرنے سے محروم تھا کہ اسے بھوک

زیادہ لگی ہے یا پھراس پر کمزوری حاوی ہوئی ہے۔تمام کمرے میں اس نے ایسے ہی لیٹے لیٹے نظریں دوڑائیں اور بڑی ہی مشکل سے کروٹ بدلی۔اس باراس کی نظر کمرے کی دوسری دیوار میں لگے شلف پر پڑی جس پر موپاساں، چیخوف، اوہنری، منٹو اور پریم چند کی کتابیں رکھی تھیں۔ وہ ان کتابوں کو دیکھ کر گھورتا رہا اور ان کتابوں کو گھورتے گھورتے پتا نہیں اسے کیا سوجھا اوراس میں نئی سی جان اور طاقت کہاں سے آئی کہ وہ جھٹ سے اٹھا اور شلف سے یہ ساری کتابیں اتار کر ایک پھٹی پرانی قمیض میں لپیٹ لیں۔اپنے سرہانے رکھے کاغذوں کا بنڈل اور ایک فائل اٹھائی اور تیزی سے کمرے سے باہر نکل آیا۔

باہر سڑک پر آتے ہی اسے لگا جیسے گرمی کا قہر چاروں طرف چھایا ہوا ہے۔ سڑک بہت گرم تھی چپل پہنے ہوئے بھی اسے لگ رہا تھا جیسے وہ شعلوں پر چل رہا ہے۔ چلتے چلتے جلد ہی اس کے تیز قدموں کی رفتار سُست پڑنے لگی وہ دونوں اطراف دکانوں کے بورڈ پڑھ رہا تھا۔جیسے اسے کسی خاص جگہ کی تلاش تھی۔تھوڑی دور جا کر اس کی نظر ایک روزنامہ اخبار کے دفتر کے بورڈ پر پڑی اور وہ سیدھے اندر جا گُسا۔

دفتر کے سارے ملازم اپنے کام میں مشغول تھے۔کسی کو بھی اس کی موجودگی کا احساس نہ ہوا۔دفتر کے اندر ایک اور دروازہ تھا جس کے اوپر ایک تختی پر ایڈیٹر لکھا تھا۔وہ بغیر کسی کی اجازت کے اندر داخل ہوا۔

ایڈیٹر سر جھکائے خبروں کی نوک پلک سنوار رہا تھا اور ایڈیٹر کے ٹیبل کی دوسری طرف ایک اور صاحب آرام سے بیٹھے تھے۔اجنبی شخص کو اندر آتے ہوئے دیکھ کر ایڈیٹر نے سر اٹھایا اور پوچھا۔

کیا کام ہے۔

جی!.....جی میں یہ.....

جی میں یہ کتابیں بیچنے آیا تھا۔

کتابیں!

ایڈیٹر نے حیرت سے پوچھا اور ایک نظر پھٹی پرانی قمیض سے بنی گٹھری پر ڈالی۔

کیا تم نے باہر لکھا بورڈ نہیں پڑھا۔ یہ ایک اخبار کا دفتر ہے' کسی کباڑی کی دکان نہیں۔

جی جانتا ہوں' آپ ایک نظر ان کتابوں کو دیکھئے تو صحیح' بڑی ہی اہم اور جینیس (Genius) لوگوں کی کتابیں ہیں۔شاید آپ کے کام آسکیں اور مجھے لگتا ہے کہ ان سے اس آفس کی شوبھا بھی بڑھے گی۔

نہیں نہیں مجھے ضرورت نہیں۔

دیکھئے صاحب انکار نہ کیجئے' خرید لیجئے انہیں

اگر ان کو بیچنا اتنا ہی ضروری ہے تو جاؤ کسی کباڑی کی دکان پر جا کر انہیں بیچو' ردی کے بھاؤ بِک جائیں گی۔

ردی!

نہیں نہیں' آپ نے دیکھا نہیں یہ موپاساں..... یہ چیخوف..... او ہنری ..... منٹو اور پریم چند کی کتابیں ہیں۔اتنے بڑے لوگوں کی کتابیں اور ردی کے بھاؤ نہیں نہیں بالکل نہیں.....

ان سے اتنی ہی محبت ہے تو انہیں بیچنے کیوں نکلے ہو۔

صاحب پیسوں کی سخت ضرورت ہے۔اسی لیے.....

دیکھو میرا وقت برباد نہ کرو' جاؤ یہاں سے۔

وہ مایوس ہوا لیکن دوسرے ہی لمحے فائل کو ایڈیٹر کی اور بڑھا دیا۔

یہ کیا ہے۔

جی یہ میری ڈگریاں ہیں۔ میری زندگی میں کسی کام نہ آسکیں آپ انہیں رکھ لیجئے۔ بس مجھے چند روپے دے دیجئے۔

پاگل ہوگئے ہو۔ کیسی بہکی باتیں کر رہے ہو۔ یہ ڈگریاں تمہاری ہو کے جب تمہارے کام نہ آسکیں تو بھلا میرے کس کام آئیں گی۔ اگر اتنے ہی پڑھے لکھے ہو تو کوئی کام دھندا کیوں نہیں کرتے۔

کرتا تھا صاحب کام بھی کرتا تھا۔ پر کبھی میں نے کام کو چھوڑ دیا تو کبھی کام لینے والوں نے مجھے نکال دیا۔

کیوں؟

کیوں کہ میری اس سسٹم کے ساتھ کبھی نہیں بنی جو ہمارے یہاں ہے۔

کیا مطلب۔

چھوڑیئے بھی صاحب میں زیادہ دیر کھڑا نہ رہ سکوں گا۔ اس کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔

پھر بھی کچھ تو کرتے ہو گے۔

جی ہاں! لیکھک ہوں' کہانیاں لکھتا ہوں۔

اور۔ آئی۔ سی' پیسوں کی اتنی ضرورت ہے تو ٹھہرو۔ ایڈیٹر نے جیب میں ہاتھ ڈالا ہی تھا کہ وہ بولا۔

نہیں نہیں صاحب بھیک نہیں چاہیے۔

اچھا دیکھو یہ میرے دوست محسن صاحب ہیں ۔ایڈیٹر نے ٹیبل کی دوسری طرف بیٹھے شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ یہ بہت بڑے پبلشر ہیں۔شاید یہ تمہاری کوئی مدد کرسکیں اور خود خبروں کی سرخیاں درست کرنے لگا اور دھیمے ہونٹوں خود سے کہنے لگا۔ پتا نہیں یہ لوگ اجرت کس بات کی لیتے ہیں، انہیں تو خبریں بنانی بھی نہیں آتیں اور سر جھکائے اپنے کام میں محو ہو گیا۔

پبلشر نے اس کے سراپے کا جائزہ لیا اور کہا۔

بھئی تمہاری یہ چیزیں میرا مطلب ہے یہ کتابیں، ڈگریاں بھلا کون خریدے گا اور نا ہی یہ چیزیں بیچنے کی ہوتیں ہیں وہاں البتہ یہ جو تم کاغذوں کا بنڈل بغل میں دبائے بیٹھے ہو، یہ کیا ہے۔

جی یہ میری کہانیاں ہیں۔میری اپنی کتاب کا مسودہ۔

اچھا ذرا دکھاؤ تو صحیح.....

اس نے کتاب کا مسودہ پبلشر کی اور بڑھایا۔

پبلشر نے مسودے کا پہلا صفحہ پلٹا کتاب کا نام ''کرب زار'' موٹے حروف میں لکھا تھا اور پہلی ہی کہانی کا ایک اقتباس پڑھ کر بولا:

اگر تم چاہو تو میں اسے چھاپوں گا

کیا

اس کی آنکھیں کھل گئیں خوشی کی خبر سے دل زوروں سے دھڑکنے لگا۔اُسے لگا اس پبلشر کا نام محسن ہی ہونا چاہیے۔ جو اس وقت اس کے لیے واقعی ایک محسن سے کم نہ تھا۔

جی مجھے یقین نہیں ہو رہا ہے کیا واقعی آپ یہ کتاب چھاپیں گے۔وہ خوشی

سے بولا۔

ہاں ہاں بالکل۔ پبلشر نے اعتماد سے جواب دیا۔

بشرطیکہ تم اسے بیچ دو۔

بی..... چ..... بیچ دوں!!

جی میں سمجھا نہیں۔

دیکھو بھئی کتاب تو میں چھاپوں گا پر تمہارے نام سے نہیں ویسے بھی تمہیں تو کوئی جانتا نہیں۔ اگر میں یہ کتاب تمہارے نام سے چھاپوں گا تو اسے خریدے گا کون۔ کتاب چھپ کر ایسے ہی پڑی رہے گی اور گرد و غبار کی نظر ہو جائے گی۔ خوامخواہ مجھے ہزاروں روپے کا نقصان اٹھانا پڑے گا۔ اسی لیے اگر تم چاہو اسے مجھے دے دو۔ میں اس کی قیمت دے سکتا ہوں۔

بیچ دوں! وہ اپنے ساتھ بڑ بڑایا کیا فن کی بھی کوئی قیمت ہوتی ہے اور اگر قیمت ہی نہیں ہوتی تو میں اسے بیچوں گا کیسے اور یہ خودغرض خریدے گا کیسے۔ کیا مجھے اب یہی دن دیکھنا باقی رہ گیا تھا کہ اپنے فن کی سرِ بازار نیلامی دیکھوں۔

کیا سوچ رہے ہو۔ پبلشر نے کہا۔

جی کچھ بھی تو نہیں۔ پر آپ یہ کتاب کس کے نام سے چھاپیں گے۔

ہیں چند لوگ جن کے نام کا سکہ چلتا ہے۔ دیکھنا کتاب ہاتھوں ہاتھ بکے گی اور میرا یہ وعدہ ہے منافع میں سے کچھ اور روپے تمہیں ضرور دوں گا۔

نہیں نہیں صاحب یہ صرف کہانیاں نہیں بلکہ میری زندگی کا کُل سرمایہ ہے۔ ان کہانیوں کی لکھائی میں جو آپ کو سیاہی نظر آتی ہے وہ دراصل میرا خون ہے میرا خونِ جگر۔ بھلا میں اسے کیسے بیچ سکتا ہوں۔ میں ہر ایک چیز سے بے نیاز رہا

زندگی کی سختیاں اور تکلیفیں برداشت کیں۔ رات رات بھر جاگ کر یہ کہانیاں لکھیں۔ کیونکہ مجھے لکھنا ہی تھا' لکھنا میرا فرض ہے اور میں اپنے فرض سے منہ نہیں موڑ سکتا۔ ایک شاعر جب غزل کا مطلع شروع کرتا ہے تو مقطع تک آتے آتے صدیوں کے کرب سے گزرتا ہے۔ میں بھی یہ کہانیاں لکھتے لکھتے ہزار بار مرا ہوں اور ہزار بار جی اٹھا ہوں' یہ میرا خون ہے' میرا خون جگر بھلا میں اسے کیسے بیچ سکتا ہوں۔ اس نے کتاب کا مسودہ اپنے سینے سے لگایا اور اس پر ہاتھ پھیرنے لگا بالکل اسی طرح جیسے کوئی باپ اپنی اولاد کو گلے لگا کر شفقت بھرا ہاتھ پھیرتا ہے۔

دیکھو جذباتی مت بنو' پبلشر نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

تم جیتے جی یہ کتاب چھاپ تو نہیں سکتے کیونکہ تمہارے حالات ہی کچھ ایسے ہیں۔ بھلا اس کتاب کا کیا کرو گے۔ پھر ہو سکتا ہے تمہارے مرنے کے بعد یہ کسی ردی والے کو بیچ دی جائے یا پھر کوئی اور اسے اپنے نام سے چھپوائے گا۔ تمہارے جیتے جی اگر تمہارا یہ سرمایہ تمہارے کسی کام نہ آ سکا تو اس کا فائدہ کیا؟

نہیں نہیں!! میں ایسا نہیں کر سکتا۔ اس نے صاف انکار کیا..... پھر اسے ہر دن کے نئے تقاضے یاد آئے' ان مشکلات کا خیال آیا جن کا وہ ہر روز سامنا کرتا ہے۔ زندگی کی پتھریلی رہ گزر' جس پر چلتے چلتے اب اس کے پاؤں لہولہان ہو چکے تھے' خیال آتے ہی وہ چونک پڑا اور تبھی اس کے تمام جسم میں بھوک اور کمزوری کی ساری گھنٹیاں ایک ساتھ بجنے لگیں۔ وہ کتاب کا مسودہ پبلشر کی اور بڑھاتے ہوئے بولا۔

اچھا ٹھیک ہے' جیسے آپ کی مرضی۔

پبلشر نے چند بڑے نوٹ نکال کر اس کے پسینے سے لت پت ہاتھوں میں تھما دئے اور اس کی مٹھی بند کر دی۔ اس نے پھٹی قمیض میں لپٹی کتابوں کی اور اپنی

ڈگریوں کی فایل کی اور ایک نظر دیکھا اور ان کو وہیں چھوڑ کر بغیر کسی سے کچھ کہے باہر نکل آیا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا آج اس کی شکست ہوئی یا فتح۔ اس نے زندہ رہنے کے لیے خود کو بیچ دیا یا پھر موت پر فتح پانے کے لیے چند دنوں کی زندگی خرید لی۔ وہ کسی ہوٹل کی تلاش میں جلدی جلدی جا رہا تھا۔ تا کہ وہ پیٹ کی آگ جلد سے جلد بجھا سکے۔ اس نے سامنے ہی ایک ڈھابہ دیکھا۔ اس نے بیٹھتے ہی کھانا جلدی لانے کے لیے کہا۔ کچھ دیر بعد اس کے سامنے ٹیبل پر کھانا لگا تھا۔ لیکن وہ اندر ہی اندر عجیب سوچوں میں گم تھا آج اس کی امیدوں، اس کے ارمانوں، اس کے خوابوں اور اس کے ضمیر کا خون ہوا۔ کیونکہ آج اس نے اپنے خون سے سینچے ہوئے فن کو بیچ دیا تھا۔

پہلا نوالہ اٹھاتے ہی، وہ زور سے تھوکا اور خالی پیٹ قے کرنے لگا۔

''ارے یہ تو خون ہے''۔ خون سے لت پت نوالہ، خون سے بنی ہوئی روٹیاں، ان پلیٹوں میں بھی خون ہی خون ہے۔ اُف اس پانی کے گلاس کا رنگ بھی سرخ ہے، ارے یہ بھی تو خون ہی ہے۔ وہ سارا کھانا ایسے ہی چھوڑ کر بے تحاشا بھاگنے لگا اور خون خون چلاتا رہا۔

تھوڑی دیر بعد وہ تپتی سڑک پر غش کھا کر گرا پڑا تھا اور اس کی مٹھی میں موجود روپے سڑک پر اِدھر اُدھر بکھرے پڑے تھے۔

☆☆☆

سانجھا درد

خزاں کا موسم چل رہا تھا۔

ہوا کا تیز جھونکا جب رنگیلا سے ٹکرایا تو رنگیلا کے سارے بدن میں تھرتھراہٹ سی پیدا ہوئی۔اس نے ایک لمبی انگڑائی لی اور اپنی چونچ سے اپنے سینے کو کھجانے لگا۔

رنگیلا سمجھ گیا اب جاڑے کی آمد آمد ہے

اس نے ایک لمبی سی اُڑان بھری اور اپنی سریلی کے پاس چلا گیا۔اس کے ساتھ چونچ سے چونچ ملا کر کہنے لگا۔

سنتی ہو۔

اب جاڑے کا موسم آنے کو ہے۔ہمیں اپنے گھونسلے کو اور بھی زیادہ گرم رکھنا ہوگا اور پہلے سے بھی زیادہ احتیاط بھرتنا ہوگی۔آخر اپنے نئے مہمان کی خاطر یہ سب تو کرنا ہی پڑے گا۔

ہاں ہاں کیوں نہیں۔

سریلی نے اقرار میں سر ہلایا۔

پھر دونوں نے اپنے سر اوپر آسمان کی طرف اٹھائے اور من ہی من اوپر والے کا شکریہ ادا کرنے لگے۔کچھ روز پہلے انہیں اس خوشی کی امید بھی نہ رہی تھی جو

اب اس وقت انہیں اوپر والے کی مہربانی سے نصیب ہوئی۔ کچھ روز پہلے ان کے گھونسلے میں کچھ انڈے تھے جن سے ان کی امیدیں وابستہ تھیں۔ پر ان انڈوں سے جو بھی بچے نکلے ان میں سے کوئی بھی زندہ نہ بچا۔ سوائے ایک آخری انڈے کے۔ آخری انڈے سے جو بچہ نکلا وہ نہایت کمزور ہونے کے باوجود اوپر والے کے کرم سے زندہ رہا اور یوں رنگیلا اور سریلی کی دنیا خوشیوں سے آباد ہوئی۔ وہ دونوں نہایت خوش ہوئے اور اوپر والے کا شکر بجالایا۔ ان کی برادری کے تمام پرندے دور دور جنگل سے آئے اور رنگیلا اور سریلی کو مبارک باد دی اور ان کی خوشیوں میں شریک ہوئے۔ ان میں بوڑھا کوا ''کاکا سیانا'' بھی موجود تھا۔ سبھی پرندے ''کاکا سیانا'' کی بڑی عزت کرتے اور اس کی ہر بات مانتے کیونکہ ''کاکا سیانا'' عمر، تجربے اور دانائی میں دوسروں سے بہت آگے تھے۔ نئے مہمان کا نام رنگیلا اور سریلی نے بڑے چاؤ سے چھیلا رکھا۔

نیا مہمان چھیلا گھونسلے میں پڑا ہوا تھا اور باہر رنگیلا اور سریلی آنے والے جاڑے سے نمٹنے کے لیے انتظامات کے بارے میں مشورہ کر رہے تھے۔ دونوں نے یہ طے کر لیا کہ ایسا انتظام کریں گے جس سے ان کا لال سلامت رہے۔ دونوں نے اڑان بھری اور جنگل میں دور دور سے گھاس کے تنکے جمع کیے اور ساتھ ہی کھانے کے لیے کچھ دانے بھی کہیں سے چگ کر لائے۔ وہ اسی طرح ہر روز دوسرے پرندوں کے ساتھ نکل پڑتے اور یوں اپنے اور اپنے چھیلا کے لیے کھانے کا انتظام کرتے۔

پھر سارا جنگل سفید برف کی چادر سے ڈھک گیا۔ برف کے گالے آسمان سے کھیلتے ناچتے گرتے رہے۔ سرد برفیلی ہوائیں زوروں سے چل رہی تھیں۔ رنگیلا اور سریلی نے اپنے جگر کے ٹکڑے کو گلے سے لگائے رکھا۔ اُسے ہر قسم کی آسائش رکھی

اور اس کی حفاظت میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ سریلی ویسے بھی اپنے لختِ جگر کے لیے کچھ زیادہ ہی دیوانی تھی۔ ہر وقت چھیلا کی صحت و سلامتی کی دعائیں مانگتی رہتی اور اپنے نورِ چشم کی بلائیں لیتی رہتی۔ اپنے کھانے میں سے زیادہ تر دانے نوالے بنا کر اسے چونچ سے کھلاتی رہتی۔ رنگیلا اور سریلی کا خوشیوں بھرا سنسار جنگل کے ایک پیڑ پر بسا ہوا تھا۔ پھر وقت گذرا، موسم بدلا، چھیلا کے چھوٹے چھوٹے پر نکل آئے اور رنگیلا اور سریلی کے ساتھ اڑان بھی بھرنا چاہی لیکن ناکام رہا، کئی بار گر گر پڑا۔ مگر وقت ایک جیسا نہیں رہتا۔ ایک دن چھیلا ہلکی سی اڑان بھرنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ وہ رنگیلا اور سریلی کی زندگی کا سب سے بڑا خوشی کا دن تھا۔ وہ ساتھ ساتھ تینوں اُڑے اور جنگل میں دور دور تک گھومنے پھرنے لگے۔ جب تینوں دور بہت دور نکل آئے تو ایک جگہ رنگیلا نے سریلی اور چھیلا کو رُکنے کے لیے کہا۔

تب رنگیلا نے بڑا سنجیدہ ہو کر چھیلا کو نیچے دور بستی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سمجھایا۔

دیکھو بیٹا۔

وہ..... وہاں بستی ہے۔ انسانوں کی بستی۔

وہاں کبھی نہیں جانا۔ کبھی بھی نہیں۔

کیوں.....؟

کیوں کا کیا مطلب۔

بس میں نے کہہ دیا۔

آخر کیوں.....؟

چھیلا نے پھر پوچھا تو

سریلی نے بیچ میں پڑتے ہوئے کہا۔

رہنے دیجئے میں سمجھاتی ہوں۔

بیٹا وہاں بستی میں موت کا رقص چلتا ہے۔

سریلی ہکلانے لگی۔

قدم..... قدم..... پر صیاد اور شکاری بیٹھے ہیں جنہیں کسی بھی پرندے کی پرواز ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ وہاں بستی میں جانے کی قطعی ضرورت نہیں وہاں سب سے خطرناک جانور رہتا ہے۔

جانور!

ہاں ہاں بیٹا جانور۔

پراماں جانور تو جنگل میں رہتے ہیں۔

جانے بھی دو۔ سریلی نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

بس تم اتنا وعدہ کرلو کہ تم کبھی بھی وہاں نہیں جاؤ گے۔

کیوں وعدہ کرلوں۔ کیا آپ لوگ کبھی وہاں نہیں گئے ہو۔

رنگیلا نے چھیلا کو پھر سمجھاتے ہوئے کہا۔

ہاں ہاں گئے ہیں بلکہ سچ تو یہ ہے پہلے ہم بستی میں ہی رہتے تھے، وہاں کے کھیت، کھلیان، باغ، باغیچے، بڑی بڑی عمارتیں، قمقموں سے جگمگاتی سڑکیں، بستی کے دونوں اطراف جھیلیں غرض سبھی جگہ خوب گھومے پھرے ہیں..... پر!

پر کیا.....!!

پر بیٹا اب وہ زمانہ نہ رہا۔ اب وہ بستی وہ بستی نہ رہی۔ موت کا آسیب اس کی چاروں اور منہ کھولے بیٹھا ہوا ہے اور روز کئی جانیں نگل جاتا ہے۔ روز وہاں خون کا کھیل کھیلا جاتا ہے۔ سُریلی اور ہماری برادری کے دوسرے پرندے بستی سے بھاگ

کر یہاں جنگل میں آ گئے کیونکہ یہاں کوئی فتنہ نہیں، فساد نہیں اور نہ کوئی منحوس سایہ ہے۔ رنگیلا کہتے کہتے رُک گیا اور رنگیلا اور سریلی نے اپنے سر نیچے کیے جیسے انسان کے کرموں پر شرمندہ ہوں۔

چھیلا ان کی باتیں سن رہا تھا کچھ کچھ باتیں اس کی سمجھ میں آتیں اور کچھ نہیں مگر کھیت کھلیان، باغ، باغیچوں، اونچی اونچی عمارتوں، قمقموں سے جگمگاتی سڑکوں اور خوبصورت جھیلوں کا ذکر سن کر اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک عود کر آئی۔ دیکھنے میں تو وہ رنگیلا اور سریلی کی باتیں سن رہا تھا، پر اندر ہی اندر وہ بستی کے ان دیکھے مناظر کو تصور میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ سب ان دیکھے منظر اس کے لیے باعثِ کشش تھے اور باتوں کی طرف چھیلا کی توجہ کچھ خاص گئی ہی نہیں اور نا ہی اسے کسی قسم کا خوف محسوس ہوا۔ وہ تو اپنے خیالوں میں کھوسا گیا۔

کہاں کھو گئے۔

رنگیلا تھوڑا سا چلایا۔

تم سن رہے ہونا۔ بستی کی اور کبھی نہیں جانا۔!

چلو اب واپس چلتے ہیں۔ وہ تینوں اپنے گھونسلے کی اور واپس لوٹے۔

اگلے روز رنگیلا اور سریلی ساتھ بیٹھے یوں ہی کچھ ہنسی مذاق کر رہے تھے کہ ''کاکا سیانا'' آیا اس کے ساتھ چھیلا بھی تھا'' کاکا سیانا'' تھوڑا سا غصے میں تھا اور ترش لہجے میں کہنے لگا۔

یہ لو سنبھالو اپنے لاڈلے کو بستی کی اور جا رہا تھا یہ تو اچھا ہوا میری نظر پڑی اور میں لپک کر گیا اور اس کو ڈانٹ ڈپٹ کر واپس لے آیا۔

رنگیلا اور سریلی دونوں شرمندہ ہوئے اور چھیلا پر غصہ بھی۔

چند روز بعد جب چھیلا اپنے دوستوں کے ساتھ جنگل میں گھوم پھر رہا تھا۔

تب اس نے اپنے دوستوں سے کہا۔

چلو بستی کی اور چلتے ہیں۔

نہیں نہیں بابا۔

اس کے ایک دوست، جس کی آواز کچھ زیادہ ہی پتلی تھی، نے جواب دیا۔

''ہمیں مرنے کا شوق نہیں ہے''۔

ارے بزدلو چلو چلتے ہیں۔ پر اس کے دوستوں میں سے کوئی راضی نہ ہوا۔ دوستوں نے اسے روکنا بھی چاہا پر وہ نہ مانا اور بستی کی اور نکل گیا۔

لمبی اڑان بھرنے کے بعد جب چھیلا بستی کے نزدیک آتا گیا۔ اس کا تجسس اور بھی زیادہ گہرا ہوتا گیا۔ اُسے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ وہ ان سب چیزوں کا نظارہ کرنے والا ہے جو اس کے تصور میں بسے تھے۔ ٹین کی چھتوں سے سجی دور دور تک پھیلی ہوئی بستی، لمبی لمبی قطاروں والے بازار، خوبصورت سڑکیں اور ان پر دوڑتی بھاگتی بے شمار گاڑیاں اور ہر طرف لاتعداد لوگ۔ ابھی تو اسے کھیت، کھلیان، باغ، باغیچے اور جھیلیں بھی دیکھنی تھیں۔ ایک لمحے کے لیے اسے لگا شاید اس کے ماں باپ نے اسے بستی کے بارے میں جو کچھ بولا جھوٹ تھا۔ کیونکہ اسے سب کچھ ٹھیک ٹھاک اور ایک دم اچھا لگا۔

وہ بستی کے نظاروں میں کھویا ہوا تھا کہ اچانک دل کو دہلانے والی دھماکوں کی آوازوں سے پوری بستی ہل گئی۔ لوگ ایک دوسرے کو کچلتے ہوئے بھاگنے لگے، ہر طرف چیخ و پکار سنائی دینے لگی۔ خوشگوار منظر دیکھتے دیکھتے ماتم میں بدل گیا۔ چھیلا یہ منظر دیکھ کر بے حد گھبرایا اور گھبرا کر ایک مکان کی چھت کے اوپر دُبک کے چھپ گیا۔

ادھر جنگل میں رنگیلا اور سریلی کو جب پتہ چلا تو انہوں نے بے حد شور وغل مچایا۔ برادری کے سبھی پرندے جمع ہو گئے۔ ''کا کا سیانا'' بھی آ گیا۔ سریلی واویلا کرنے لگی اور وہ بستی کی اور اپنے چھیلا کو ڈھونڈنے کے لیے نکل جانا چاہتی تھی لیکن دوسرے پرندوں نے اس کو روکا۔ تب ''کا کا سیانا'' نے رنگیلا سے کہا۔

سمجھاؤ اپنی سریلی کو اس طرح جذبات میں آ کر کوئی بھی قدم اٹھانا ٹھیک نہیں ہوگا۔ اب صبر کرنا ہوگا۔ اگر چھیلا کی قسمت میں واپس لوٹنا ہوگا تو لوٹ آئے گا۔ ورنہ جیسے اوپر والے کی مرضی۔

چھیلا کچھ دیر اسی ٹین کی چھت پر بیٹھا رہا۔ چاروں اور عجیب منحوس سی خاموشی چھا گئی۔ اس نے من ہی من سوچا یہی موقع ہے مجھے واپس جنگل کی اور چلنا چاہیے۔ ایک بار بس ایک بار واپس جنگل پہنچ جاؤں پھر بستی میں نہیں آؤں گا اور پھر اس نے جلدی سے ایک اڑان بھری اور وہ تیزی سے اڑنے لگا کہ ایک خوف ناک آواز گونجی اور اسے اپنے بدن میں ایک گرم سی چیز سرایت کرتی ہوئی محسوس ہوئی اور اس کی پرواز ڈھگمگانے لگی وہ دیکھتے ہی دیکھتے سڑک پر گر پڑا۔ اسے ہچکی آ گئی اس نے ایک لمبی انگڑائی لی اور اپنے پر پھیلا دیئے تھوڑا سا تڑپنے لگا یہاں تک اس نے دم توڑ دیا۔

سڑک پر پہلے ہی جگہ جگہ انسانی خون کے دھبے تھے اور چند لاشیں بھی ادھر اُدھر بکھری پڑی ہوئی تھیں۔ بستی کے لوگ اپنوں کے واپس لوٹنے کا انتظار کر رہے تھے۔ جو صبح سویرے اپنے گھروں سے نکلے تھے۔ ادھر رنگیلا سریلی اور ان کی برادری کے تمام پرندے چھیلا کے واپس لوٹنے کا انتظار کر رہے تھے۔ انتظار کرتے کرتے سب کی آنکھیں تھک گئیں، پر بستی کے چند لوگوں کی طرح چھیلا واپس لوٹ کر نہیں آیا۔ شام ہوتے ہوتے جنگل اور بستی سانجھے درد میں ڈوب چکے تھے۔ ☆☆

کاغذی لشکر کا سپاہی

کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے؟

پوچھ تاچھ کے لیے!

پوچھ تاچھ؟

جی!

کیسی پوچھ تاچھ اور کیوں (کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد)

پر..... پر مجھے دیر ہوگئی ہے مجھے گھر جانا ہے۔

آپ ہمارے چند سوالات کے جواب دیجئے اور گھر چلے جایئے۔

اچھا ٹھیک ہے پوچھئے کیا پوچھنا ہے۔

ہمیں شکایت ملی ہے کہ آپ عمارتِ عالیہ (جو ہم سب کے لیے باعثِ تعظیم ہے) کے سامنے تھوکتے رہتے ہیں۔

نہیں تو۔

جی بالکل ہماری اطلاع کبھی غلط نہیں ہوسکتی۔

پر۔

پر تھوک اور تھوکنا ایک فطری عمل ہے کبھی بھی کسی کو بھی اس عمل کی ضرورت محسوس ہوسکتی ہے۔ بھلا اس میں میری کیا غلطی ہے۔

مگر کسی خاص اور مخصوص جگہ پر تھوکنا..... اور بار بار تھوکنا..... اس کے کئی

معنی اور مطلب نکلتے ہیں۔

مثلاً؟

مثال کے طور پر..... خیر ابھی رہنے دیجئے پہلے یہ بتائیے کیا یہ سچ ہے۔

کچھ ٹھیک سے یاد نہیں۔ شاید میں نے کبھی پریشانی کی حالت میں ایسا کیا ہو۔ جان بوجھ کر نہیں۔

پریشانی کی حالت میں؟

جی۔

کیسی پریشانی؟

وہ..... وہ کیا ہے کہ آج کل میں رات بھر سو نہیں پاتا۔

سو نہیں پاتا..... کیوں نیند نہیں آتی یا پھر بیوی سونے نہیں دیتی۔

ہاہاہا..... سوری سوری بس یوں ہی مذاق میں کہا ہے ویسے آپ شادی شدہ تو ہوں گے۔ پولیس انسپکٹر پہلی بار کرسی سے اُٹھا اور اُس کی طرف بڑھا مگر اس کے چہرے پر مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔

تو آپ کا کہنا ہے کہ آپ جان بوجھ کر یہ فعل نہیں کرتے مگر ہماری اطلاع کے مطابق آپ کو روز سہ پہر اُس عمارت کے سامنے سے گذرتے ہوئے اور رات کو یہ گستاخی کرتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔

ویسے آپ کام کیا کرتے ہیں؟ انسپکٹر نے اپنے دونوں بازو ٹیبل پر رکھتے ہوئے اپنے جسم کا بوجھ اُس پر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

وہ تھوڑی دیر خاموش رہا اور پھر کہنے لگا۔

جب آپ کو یہ سب ساری اطلاعات ہیں تو آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ میں کام کیا کرتا ہوں۔

جی بالکل۔ ہم آپ کے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں مگر ہم آپ کی زبان سے سننا چاہتے ہیں۔

وہ کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر اُس کی نظریں بائیں طرف زنگ آلودہ سلاخوں والے حوالات پر پڑی۔ اندھیری کوٹھری.....وہ ڈر گیا۔ اس کے سارے بدن میں جھرجھری سی ہوئی۔

میں نے آپ سے کچھ پوچھا ہے۔ انسپکٹر چلایا۔

جی میں ایک صحافی ہوں۔ ایک نیوز پیپر میں۔ ویسے آپ اور کیا کیا مجھ سے سننا چاہتے ہیں۔

ویٹ ویٹ صبر رکھیں مسٹر.....

ویسے آپ کا نام کیا ہے؟

امن دیوالیہ۔

کیا؟ کیا؟..... کیا کہا؟

جی امن دیوالیہ۔

تعجب ہے ایسا نام پہلی بار سنا ہے جس میں دیوالیہ ساتھ جڑا ہو۔ (انسپکٹر نے اپنی ہنسی روکتے ہوئے کہا).....

یہ میرا نجی مسئلہ ہے۔

او کے.....او کے..... خیر کہاں رہتے ہیں آپ۔

شہر کے وسط میں (شہر خاص میں)

اس سے پہلے کبھی تھانے میں آنا ہوا ہے۔

جی نہیں۔

اس کا مطلب امن پسند شہری ہیں آپ۔

آپ ایسا کہہ سکتے ہیں۔

کیا آپ جمہوریت کے حمایتی ہیں۔

خاموشی۔

تو پھر کیا آپ جمہوریت کے مخالف ہیں۔انسپکٹر نے زور دے کر پوچھا۔

خاموشی۔

جواب دیجئے کچھ تو جواب دیجئے آپ کی خاموشی آپ کے لیے مشکلیں پیدا کر سکتی ہیں۔(انسپکٹر تھوڑا غصے بھرے لہجے میں)۔

جی.....جی کچھ کہہ نہیں سکتا۔کبھی اس کے بارے میں سوچا نہیں۔اسی لیے وثوق یا اعتماد کے ساتھ کچھ کہہ نہیں سکتا۔

ٹھیک ہے۔

اچھا یہ بتائیے کبھی ووٹ ڈالا ہے(انسپکٹر نے الگ ڈھنگ سے پوچھنے کی کوشش کی۔)

میں اس کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھتا۔

اس نے اپنے آپ کو بچاتے ہوئے کہا۔

او کے جیسا آپ مناسب سمجھیں۔(انسپکٹر نے لمبی آہ بھرتے ہوئے کہا)۔

امن دیوالیہ کو انسپکٹر کے چہرے پر ناراضگی دِکھی اور جٹ سے بول پڑا۔

دیکھئے آپ ناراض مت ہو جائے (امن دیوالیہ نے اپنی گھبراہٹ چھپاتے ہوئے کہا)اصل میں مجھے سیاہ ست کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

سیاہ ست؟.....

جی سوری سیاست۔

مجھے کبھی بھی ان معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں رہی ہے اس بات میں کوئی شک نہیں کہ موجودہ دور کے انسان کا خدا سیاہ ست دان ہے اور آئی ایم سوری سیاست دان ہی ہے کیونکہ عصر حاضر کے انسان کو لگتا ہے کہ اس کی تمام تر پریشانیوں کا ازالہ سیاہ ست دان ہی کر سکتا ہے اسی لیے اُس پر آنکھیں بند کر کے حد سے زیادہ بھروسہ کرتا ہے۔ پھر وہی اُسے تباہی کے دہانے پر پہنچا دیتا ہے۔موجودہ دور میں دیکھیے تو ہر سو جو تباہی نظر آتی ہے وہ انسان کے اسی فلسفے کا حصول ہے کہ انسان سیاہ ست کو اپنا ایمان بنائے بیٹھا ہے اور نتیجہ ہر سو تباہی اور بے یقینی ہے۔نہ کہیں چین ہے نا ہی سکون۔

آئی، ایم اگین سوری..... سیاست۔

ساری دنیا کی فکر لگی ہے آپ کو۔مسٹر امن دیوالیہ۔

جی نہیں بس یوں ہی کہہ دیا۔ویسے بھی میرا کہنا اور کرنا زیادہ معنی نہیں رکھتا۔ میری شناخت کیا ہے..... میں تو بس کاغذوں میں درج ایک نام ایک نشان ایک ہندسہ ہوں۔اقوام متحدہ سے لے کر اپنے محلے کی کمیٹی تک صرف کاغذوں میں درج ایک نام ایک ہندسہ اور کچھ نہیں۔

اچھا تو دنیا سے بیزار ہیں آپ۔

اچھا یہ بتایئے آپ نے اپنی باتوں میں کسی پریشانی کا ذکر کیا تھا اور میں نے اُسے ہنسی مذاق میں ٹال دیا تھا۔ویسے کیا پریشانی ہے آپ کو انسپکٹر نے بڑی ہمدردی اور فکرمندی سے پوچھا۔

کوئی خاص بڑی بات نہیں ہے وہ کیا ہے کہ میں چند راتوں سے ٹھیک سے سو نہیں پا رہا ہوں۔

وہ کیوں؟ کوئی خاص وجہ؟ انسپکٹر نے جٹ سے پوچھا۔
وہ..... وہ..... وہ میرے کمرے میں کچھ دنوں سے ایک گھوس آیا ہے۔
کون گھوس آیا ہے؟
جی..... ایک مچھر۔
ویسے آپ کو یہ بہت معمولی بات لگے گی اور شاید ہے بھی لیکن میرے لیے بہت بڑا مسئلہ ہے کیونکہ چندروز سے جب بھی سونے کی کوشش کرتا ہوں وہ میری نیند میں خلل ڈالتا ہے میں جب آنکھیں بند کرتا ہوں وہ کانوں کے نزدیک آ کر بین بجاتا ہے اور میں اُٹھ کر بیٹھ جاتا ہوں اور قوالوں کی طرح اپنے ہاتھ بجاتا رہتا ہوں اور میری بیوی خراٹے لے کر سوئی پڑی رہتی ہے۔
تو پھر۔
پھر کیا' دن بھر اونگھتا رہتا ہوں۔اوٹ پٹانگ باتیں کرتا رہتا ہوں اور کبھی کبھی لگتا ہے غش کھا کر گر پڑوں گا۔شاید ایسی حالت میں کبھی کبھی مجھ سے ایسی کوئی غلطی سرزد ہوئی ہو۔(تھوکنے کی غلطی)
جان بوجھ کر تو بالکل بھی نہیں۔آپ میری حالت سمجھ سکتے ہیں۔
پر اس چھوٹی سی مشکل کے لیے تو کئی علاج ہے (انسپکٹر نے پھر مسکرا کر کہا)
جی ہے تو پر ہر بار کوشش کی مگر ہر علاج نا کام رہا۔
اصل میں وہ بہت چالاک ہے بلکہ شاطر مچھر ہے۔جب کبھی میں اُس کو مارنے کے لیے کوئی طریقہ آزماتا ہوں وہ پہلے سے بھی اور زیادہ چونکنا ہو جاتا ہے۔
خیر..... انسپکٹر نے ایک لمبی آہ بھری اور ایک چھوٹی سی انگڑائی لے کر پوچھا۔
تو یہی ہے آپ کی پریشانی۔

جی۔

اب!

تو اب کیا کرنا؟ انسپکٹر نے پوچھا۔

جی..... وہ کیا ہے کہ مجھے گھر جانا ہے اور گھر جانے سے پہلے کچھ چیزیں بھی خریدنی ہیں۔

مُنی کے لیے فراک اور چھوٹو کے لیے سپورٹس شوز۔ وہ اپنے ساتھ بڑبڑایا۔

مجھے گھر جانے دیجیے پلیز۔ (اس کے لہجے میں التجا تھی)۔

تو یہاں سے نکل کر آپ یہ چیزیں خریدنے جائیں گے۔ انسپکٹر نے کچھ حیرت سے پوچھا۔

جی..... حضور بالکل۔ کیوں؟

آپ کو کیا لگتا ہے مجھے یہاں سے نکل کر یہ سب چیزیں خریدنے کے بجائے کیا کفن خریدنے جانا چاہیے۔ (امن دیوالیہ کچھ بھڑک سا اٹھا)۔

نہیں نہیں میں نے ایسا تو نہیں کہا۔ انسپکٹر نے کچھ جھنجھلا کر جواب دیا اور ساتھ ہی کہنے لگا۔

وہ کیا ہے کہ آپ بڑے دلچسپ آدمی لگے اور آپ کی باتیں اور بھی زیادہ دلچسپ ہیں ابھی آپ کو جانے دینے کا من نہیں کر رہا ہے۔ اچھا یہ بتایئے ہماری اطلاع کے مطابق آپ کبھی کبھار اخبار کے دفتر کے بجائے کہیں اور جاتے ہیں۔ ایسا کیوں۔ (انسپکٹر پھر تحقیقاتی موڑ میں)۔

حضور ڈاکہ ڈالنے کی غرض سے تو نہیں جاتا۔

وہ کیا ہے کہ چند روز سے بینک جاتا ہوں، بینک سے قرضہ لینے کے غرض

سے لیکن ابھی تک منظور نہیں ہوا۔

کیوں؟ کیوں منظور نہیں ہوا۔ انسپکٹر نے سوال کیا۔

وہ کیا ہے صاحب جو کاغذات میں نے وہاں داخل کرائے ابھی نامکمل ہیں۔ پھر بینک والوں نے کہا کچھ گروی رکھو۔

اب اپنا مکان گروی رکھنے جا رہا ہوں۔ ویسے بھی اس میں کوئی قباحت نہیں اس وقت تو ہر شئے کی قیمت ہے بغیر انسان کے اچھا ہوا میرے بجائے میرے مکان کی قیمت نکلی۔

ایک جیتے جاگتے انسان کی قیمت کچھ بھی نہیں..... خیر چھوڑ یئے۔

جناب..... جناب کیا میں گھر جا سکتا ہوں میں نے پہلے ہی کہا مجھے کچھ چیزیں خریدنی ہیں۔ گھر پر سبھی انتظار کر رہے ہوں گے۔ اس کے لہجے میں التجا تھی۔ (پھر اُس کی نظروں کے سامنے مُنی کا فراک اور چھوٹو کے سپورٹس شوز گھومنے لگے)۔

اچھا ٹھیک ہے۔ انسپکٹر نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔

لیکن خیال رکھنا ہماری نظریں آپ پر برابر ہیں۔ آئندہ خیال رکھنا کوئی بھی نازیبا حرکت آپ کے لیے مشکل پیدا کر سکتی ہے۔ انسپکٹر نے اُسے سمجھایا۔

جی..... جی..... بالکل..... ضرور..... ضرور۔

وہ جلدی جلدی اٹھا اور فوراً تھانے سے باہر نکل آیا۔ باہر سڑک پر آ کر اُس نے اطمینان کی سانس لی۔ اُس کی دھڑکنیں اب معمول پر آنے لگیں اور اُسے قدرے سکون محسوس ہوا۔ کھلی ہوا میں آ کر اُسے اچھا لگا اور اُسے کسی حد تک راحت محسوس ہوئی اور وہ تیز تیز قدموں سے بازار سے گذرنے لگا اور من ہی من یہ سارا واقعہ یاد کرنے لگا اور انسپکٹر کی باتیں بھی۔ بازار میں چلتے چلتے اُسے ایک بار پھر یاد آیا کہ اسے مُنی

کے لیے فراک لانا ہے اور چھوٹو کے لیے سپورٹس شوز۔ وہ جلدی جلدی ان دکانوں کی تلاش میں لگ گیا۔ جہاں سے اُسے یہ چیزیں خریدنی تھیں۔شام ہونے والی تھی۔سورج غروب ہونے والا تھا۔دھوپ کا زور ٹوٹ رہا تھا اُس کے ماتھے پر ابھی بھی پسینہ آ رہا تھا۔ جسے وہ بار بار رومال کے بجائے اپنی آستین سے پونچھ رہا تھا۔ چلتے چلتے اُس کے قدم اچانک رُک گئے جب اُس کی نظر عمارت عالیہ (جو بقول انسپکٹر کے سب کے لیے باعث تعظیم ہے) پر پڑی۔

پھر..... پھر..... اُس کے قدم رُک گئے۔دماغ میں ایک عجیب قسم کی کھلبلی اٹھی اور اسے اپنے اندر ہی اندر ایک شور سا محسوس ہوا۔شور بے انتہا شور پر یہ شور کیسا....... وہ کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ اسی شور میں اُسے انسپکٹر کی نصیحت یاد آئی۔ہماری نظریں ہمیشہ آپ پر رہیں گی۔

اُسے لگا جیسے انسپکٹر دیکھ رہا ہے جیسے وہ کئی CCTV کیمروں کے بیچ کھڑا ہے۔ جہاں اُس کی ہر حرکت ریکارڈ ہو رہی ہے۔اُس کے اردگرد چلتے پھرتے لوگ اُسے جاسوس لگ رہے تھے۔ جو اس کی حرکتوں پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ پھر اُسے یاد آیا مُنی اور چھوٹو اور رانُ کی چیزیں..... فراک..... سپورٹس شوز اُس کا سر گھومنے لگا اُسے کھڑے کھڑے عجیب سی بے چینی محسوس ہونے لگی اور پھر..... اور پھر پتہ نہیں کیا ہوا کہ اچانک اُس کا منہ کھلا اور ایک آواز گونجی ''آخ تھو''۔

☆☆☆

کتھارسس

(بلراج مینرا، نور شاہ کے اردو افسانوں اور محمد امین ریشی کے کشمیری افسانے کے پلاٹ کو ملا کر ایک نیا تجربہ)

جاگتے رہو.....

بازار کی حفاظت پر معمور شخص اونچی آواز میں چلایا۔

وہ ڈنڈا اسڑک پر زور زور سے مار رہا تھا، جس کی صدائیں خاموشی کو چیرتی ہوئی دور دور تک سنائی دے رہی تھیں۔

ہوشیار خبردار۔

وہ پھر اونچی آواز میں چلایا۔

اب کی بار اس نے نظریں اٹھا کر ٹاپ کلاس بلڈنگ کی طرف دیکھا جہاں اوپر تیسری منزل پر آدھی رات گذر جانے کے باوجود بھی ایک کمرے میں روشنی تھی۔

پتہ نہیں وہاں اوپر کیا چل رہا ہے۔ وہ اپنے ساتھ بڑ بڑایا پھر چاندنی رات میں خاموش بازار کو تکنے لگا اور اونچی آوازیں لگاتا ہوا آگے بڑا۔

جاگتے رہو۔

ہوشیار خبردار۔

ادھر ٹاپ کلاس بلڈنگ کے تیسرے مالے کے اسی کمرے میں، جہاں بتی جل رہی تھی، دلچسپ گفتگو چل رہی تھی۔ کمرے کے درمیان میں رکھے بڑے سے ٹیبل کے اردگرد بچھی کرسیوں پر چار لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ دنیا جہاں اور وقت سے بے خبر

ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے ان میں سے ایک شخص، جو سامنے ٹیبل پر رکھے رائیٹنگ پیڈ سے ایک ایک صفحہ اُکھاڑتا اور اس کے پُرزے پُرزے کر کے فرش پر پھینک رہا تھا' کہنے لگا۔

.....ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ میں پیشے سے ایک ڈاکٹر ہوں۔سب اس کی طرف دیکھنے لگے۔ایک دن اوپریشن کر کے تھکا ماندا دیر رات گئے گھر لوٹ کر ابھی سویا ہی تھا کہ میرے نوکر نے مجھے جگا دیا۔میں اُس پر برس پڑا۔

کیوں کیا ہوا ابھی تو سویا ہوں۔کیوں جگایا مجھ کو۔

وہ جناب.....ایک عورت آئی ہے۔بڑی پریشان ہے آپ سے ملنا چاہتی ہے۔میں جب اپنے کمرے سے باہر نکلا تو دیکھا ایک خوبصورت جوان عورت میرا انتظار کر رہی تھی۔

وہ.....وہ ڈاکٹر صاحب.....میرے پتی بے ہوش ہیں۔اگر ان کا علاج نہ ہوا تو.....تو میری دنیا اُجڑ جائے گی۔آپ میرے ساتھ تشریف لایئے میں کوئی بھی فیس دینے کے لیے تیار ہوں۔پتہ نہیں میں کیسے راضی ہوا اور چل دیا۔جب ہم اس کی کوٹھی پر پہنچے تو دیکھا اس کا پتی بے ہوش پڑا ہوا تھا۔میں نے انجکشن لگا دیا اور وہیں پر رات کو رُک گیا۔میرا وہاں رُکنا ضروری تھا۔صبح جب اس کے پتی کو ہوش آیا۔تو اس نے میرا شکریہ ادا کیا تب میں نے کہا شکریہ میرا نہیں اپنی پتنی کا کیجئے۔وہ حیران ہوا.....میں نے دوبارہ کہا ہاں اپنی پتنی کا شکریہ ادا کیجئے اور سامنے دیوار پر لگی بڑی سی تصویر کی طرف اشارہ کیا۔مگر وہ چلایا اور چلاتے ہوئے کہا.....نہیں نہیں.....ایسا نہیں ہوسکتا۔

کیوں ایسا کیوں نہیں ہوسکتا؟

بدلے میں اس نے جو جواب دیا وہ.....وہ سن کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور میرے پیروں تلے زمین کھسک گئی۔

اُس نے ایسا کیا کہا۔باقی تین اشخاص میں سے ایک نے ڈاکٹر کوٹوکا۔

اس سے پہلے ڈاکٹر جواب دیتا۔خاموش سن رہے اشخاص میں سے ایک شخص نے مسکراتے ہوئے کہا۔

مجھے پتہ ہے کہ اس عورت کے پتی نے ڈاکٹر سے کیا کہا۔ڈاکٹر حیرت بھری ہوئی نظروں سے مسکراتے ہوئے شخص کو گھورنے لگا۔ہاں اُس عورت کے پتی نے ڈاکٹر سے.....

ٹھہریے مجھے کچھ کہنا ہے۔

اس سے پہلے آپ کچھ کہیں مجھے کچھ کہنا ہے۔دوسرے شخص نے کہا جو اتنی دیر تک ڈاکٹر کی باتیں سن رہا تھا اور فقط بیچ بیچ میں ماچس کی ڈبیا سے ایک ایک تیلی نکالتا اس سے جلا کر غور سے تکنے لگتا پھر پھونک مار کر فرش پر پھینک دیتا۔کافی دیر سے اس کے ہونٹوں میں بنا جلا سگریٹ لرز رہا تھا۔اب اس نے کہنا شروع کیا۔

ایک رات جب میری آنکھ کھلی میں وقت سے بے خبر تھا۔میں سگریٹ سلگانا چاہ رہا تھا مگر..... مگر ماچس خالی تھی۔ٹیبل پر ماچس کی چار پانچ ڈبیاں الٹی پڑی تھیں۔میں نے دیکھا سب خالی تھیں۔میں نے بتی روشن کی دو بج رہے تھے۔ میں نے ہر جگہ ڈھونڈا الماری، پتلون، جیکٹ کی جیبیں، کتابوں کی الماری، پیپر باسکٹ پر ماچس کہیں نہیں تھی۔کتابیں الٹی سیدھی پڑی ہوئی تھیں۔کپڑے ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے۔سگریٹ جلانے کی چاہ نے مجھے پریشان کر دیا۔میں نے سوچا اگر مجھے ماچس نہ ملی تو کہیں..... تو کہیں میرا دل..... پھر میں نے چادر کندھوں پر ڈال دی

اور چل دیا۔ تھوڑی دیر بعد میں سڑک پر کھڑا تھا۔ رات کالی تھی اور کافی خاموش۔ میں حلوائی کی دکان پر گیا لیکن مایوس ہوا۔ پھر آگے بڑا ایک لیمپ پوسٹ' دو لیمپ پوسٹ' ان گنت لیمپ لوسٹ پیچھے رہ گئے۔ پھر سامنے پُل تھا جس کی مرمت چل رہی تھی۔ وہاں حادثوں کی روک تھام کے لیے سرخ کپڑے میں لپٹی لالٹین جل رہی تھی۔ میرے قدم رُکے میں لالٹین سے سگریٹ جلانے ہی والا تھا کہ ایک سپاہی' جو ڈیوٹی پر تھا' چلایا۔ کون ہو اور کیا کر رہے ہو۔ کہاں رہتے ہو۔

ماڈل ٹاؤن میں۔ میں نے جواب دیا۔

اچھا ماڈل ٹاون..... ماڈل ٹاون یہاں سے دس میل کے فاصلے پر ہے۔ چلو تھانے۔

تھانیدار کو بھی میں نے کہا جناب آپ کے پاس ماچس ہوگی۔ وہ چلایا ماچس کا بچہ جاؤ گھر ورنہ بند کردوں گا۔ میں جب تھانے سے باہر آیا تو کافی تھک چُکا تھا۔ پھر پوپھٹی ایک شخص آتا ہوا دکھائی دیا۔ میں نے پوچھا جناب آپ کے پاس ماچس ہوگی۔ اُس نے.....

کیا اُس سے آپ کو ماچس دی؟ کیا آپ کی خواہش پوری ہوئی؟

وہ..... کون تھا؟ ڈاکٹر نے ایک ساتھ سوال کیے۔

اِس سے پہلے وہ ڈاکٹر کے سوال کا جواب دیتا پھر وہی مسکراتا ہوا شخص (وہی جس نے پہلے بھی ڈاکٹر کی کہانی سنتے وقت کہا تھا کہ مجھے سب پتا ہے وہی شخص) زور سے کہنے لگا۔

میں بتاتا ہوں وہ شخص کون تھا۔ اپنی روداد سنانے والا شخص حیران ہوا۔ لرزتے ہوئے ہونٹوں سے سگریٹ نکال کر اس کی اور گھورنے لگا۔ وہ مسکراتا ہوا شخص کہنے لگا۔

جو آپ کو راستے میں ملا تھا اور جس سے آپ نے ماچس مانگی تھی میں جانتا ہوں وہ کون تھا۔

وہ.....

ٹھہریئے ذرا ٹھہریئے ڈاکٹر نے بیچ میں کہا۔ یہ دونوں واقعات الگ الگ ہیں۔ آپ دونوں جگہوں پر کیسے موجود تھے۔ ڈاکٹر نے حیرت سے پوچھا۔

کیا یہ کوئی اتفاق ہے یا پھر.....

مسکراتا ہوا شخص صرف مسکراتا ہی رہا جواب میں کچھ نہ کہا۔

تھوڑے وقفے کے بعد تیسرے شخص نے کہنا شروع کیا۔

میرا نام ڈاکٹر انیس ہے۔ مجھے اپنے ایک مریض کے علاج کے لیے کافی کوفت اٹھانی پڑی مریض کا نام ہمراز تھا۔ میں روز اس کا علاج کرتا اور وہ مجھے روز اپنے ناول کا تازہ تر تحریر کردہ حصہ سناتا۔ ہمراز شام کو ناول کا جو حصہ مجھے سناتا جو اُس نے دن بھر رقم کیا ہوتا تھا وہ وہی سب کچھ ہوتا جو دن بھر میرے ساتھ ہو چکا ہوتا تھا۔ بھلا یہ کیسے ممکن تھا میں خود بھی سمجھ نہ سکا کہ میرے دن بھر کے تمام تر حالات سے ہمراز نہ جانے کیسے باخبر ہو جاتا۔ پھر مجھے عجیب ذہنی عذاب کا شکار ہونا پڑا۔ میں پریشان ہوا کہیں ہمراز میرا پیچھا تو نہیں کر رہا ہے۔ یا پھر میرے کلنک میں سی' سی' ٹی وی کیمرے نصب تو نہیں کیے گئے ہیں۔ پھر میری پریشانی نے دوسرا موڑ لیا۔ اب میرا یہ اشتیاق بڑھنے لگا کہ آخر ہمراز کے اس ناول کا کلائمکس کیا ہوگا۔ ایک روز میں اسی تجسس کے ساتھ ہمراز کے گھر گیا وہ سویا پڑا تھا۔ اُس کے پاس ہی کاغذ اور قلم پڑے ہوئے تھے۔ میں گیا اور ناول کا کلائمکس پڑھا۔ کلائمکس پڑھنے کے ساتھ ہی میں آگ بگولہ ہوا اور تیش میں آ کر کاغذ پھاڑ کر ہمراز کے منہ پر دے

مارے۔

مگر..... مگر وہ.....وہ مر چکا تھا۔ میں نے کاغذ کے پُرزے اٹھائے اور واپس جیب میں رکھ کر چلا آیا۔ڈاکٹر انیس نے وہ کاغذ کے پُرزے جیب سے نکال کر ٹیبل پر سب کی نظروں کے سامنے رکھے۔دونوں اشخاص جنہوں نے اپنے اپنے قصے سنائے ایک ساتھ پوچھ بیٹھے''ناول کا کلائمکس آخر کیا تھا''۔

ڈاکٹر انیس کچھ کہنے ہی والا تھا کہ ساتھ ہی بیٹھے مسکراتے ہوئے وہ کہنے لگا۔وہی جس نے اس سے پہلے دو قصوں کے سنتے وقت کہا تھا مجھے پتا ہے اس بار بھی اس نے پھر کہا۔

مجھے پتہ ہے کہ ناول کا کلائمکس کیا تھا۔

ارے واہ! ڈاکٹر انیس نے چونک کر کہا۔

مجھے نہیں لگتا وہ کاغذ میرے بغیر کسی اور نے بھی پڑھا ہوگا۔پھر بھلا آپ کو یہ کیسے پتہ چل پایا کہ ناول کا کلائمکس کیا تھا۔

اس سوال کے ساتھ ہی سامنے بیٹھے ڈاکٹر اور دوسرے' شخص' جو سگریٹ ہونٹوں میں دبائے ہوئے تھا' نے سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔

ہاں ہاں بھائی۔ہم کافی دیر سے دیکھ رہے ہیں آپ ہر واقعے میں اپنی شمولیت کا بھرم ہمیں دے رہے ہیں۔آخر کیا ماجرا ہے؟ کہو کہو جواب دے دو۔پھر ایک شور سا اٹھا اور وہ پھر مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔باقی تین ڈاکٹر' ماچس کی تیلیوں سے کھیلنے والا شخص اور ڈاکٹر انیس اس شخص کی طرف دیکھنے لگے اور اس کی باتیں غور سے سننے لگے۔

دیکھئے آپ پریشان نہ ہوں دراصل بات یہ ہے کہ میں ہر واقعے

میں ''میں''اس لیے شامل ہوں اور مجھے ہر اس بات کا علم، جو آپ کو لگتا ہے صرف آپ کو پتہ ہے، مجھے اس لیے ہے کیونکہ..... کیونکہ..... میں.....

اُف خدایا اتنا سارا کوڑا کرکٹ اور گندگی، کتب خانہ نہ ہوا گندگی کا ڈھیر ہو گیا۔ صفائی کرنے والی بائی کمرے میں داخل ہوتے ہی اپنے ساتھ بڑ بڑائی۔ ٹیبل اور فرش پر جگہ جگہ کاغذ کے ٹکڑے، ماچس کی تیلیاں بکھری پڑی تھیں۔ کمرے میں کوئی نہیں تھا اور بتی جل رہی تھی۔

سبھی کردار اپنی اپنی کہانیوں میں واپس جا چکے تھے اور شلف پر رکھی کتابوں اور رسالوں کی زینت بنے بیٹھے تھے۔

☆☆☆

زون

اُسے جنگلوں میں گھومنا پھرنا اچھا لگتا تھا اور ایک دن وہ انہی جنگلوں میں گھومتے پھرتے گُم ہوگئی۔ وہ کہتی تھی۔

میں چاہتی ہوں ان جنگلوں اور پربتوں میں حائل گونجتی خاموشیوں میں جذب ہوجاؤں، تحلیل ہوجاؤں۔

کیوں؟

تم سے بچھڑ جانے کے غم سے میں خوف زدہ ہوں۔

میں تمہیں بہت چاہتی ہوں، کمل۔

ایک اچھی خاصی پڑھی لکھی لڑکی کے منہ سے ایسی باتیں عجیب لگتی ہیں

کیوں؟

اس نے تعجب کا اظہار کیا۔

کیا مجھے محبت کرنے کا کوئی حق نہیں۔ تم کیا سمجھتے ہو میں اپنی ساری زندگی ان جڑی بوٹیوں، جن سے ہم دوائیاں بناتے ہیں اور جن کی کھوج میں ہم یہاں آئے ہیں، میں اپنی ساری زندگی ضائع کردوں گی ہرگز نہیں وہ تھوڑی سی خفا ہوئی اور تھوڑی دیر روٹھ جانے کے بعد خود ہی اپنے آپ کو مناتے ہوئے بولی۔

تم مجھ سے محبت کرتے ہونا

کہونا کمل ____

دیکھو پائل ____

اوہ ہو تم مجھے پائل نہیں بلکہ زون کہا کرو۔ صرف زون اس نے بات کاٹتے ہوئے کہا' جانتے ہو زون کشمیری میں چاند کو کہتے ہیں۔ اس کا نام بھی یہی تھا۔

کس کا

ایک لجنڈری کشمیری شاعرہ حبہ خاتون کا۔

حبہ خاتون کمل نے حیرت سے پوچھا۔

ہاں ہاں! حبہ خاتون۔ یہاں کشمیر کی ایک مشہور شاعرہ' محبت کا ایک خوبصورت پیکر' حسن کی دیوی' وفا کا مجسمہ جس کا نام یہاں کے لوگ بڑے خلوص کے ساتھ لیتے ہیں۔ ایک ایسا پھول جس میں محبت اور وفا کی خوشبو تھی۔ ایک عام دیہاتی لڑکی جس کا نام زون رکھا گیا جو کچھ خاص پڑھی لکھی نہ تھی۔ شاعری کا شوق ہوا تو شعر کہنے لگی۔ چونکہ وہ بڑی صلاحیتوں والی اور ذہین تھی اسی لیے اس نے جو گیت کہے وہ بے حد مقبول ہوئے۔ وہ اپنے گیت ندی سے پانی لاتے وقت اپنی سہیلیوں کے سامنے اپنی میٹھی آواز میں گاتی اور جب وہ گاتی تو یوں لگتا جیسے اس کے ساتھ ساتھ ساری وادی یہاں کی فضائیں' گھٹائیں اس کا ساتھ دے رہی ہیں۔ پھر اس کی شادی ہوئی ایک بالکل ہی ان پڑھ شخص کے ساتھ۔ اس کا شوہر شاعری اور گیتوں کا کوئی شوق نہ رکھتا تھا اور نہ اسے زون کے حسن کی کوئی قدر رہی تھی۔ وہ اپنے شوہر کی بے حسی دیکھ کر غم زدہ ہو جاتی اور اپنے غموں کا اظہار اپنے گیتوں میں کرتی۔ پھر وہ من ہی من ایک شہزادے کا تصور کرنے لگی اور اپنے خوابوں کے شہزادے کا انتظار کرنے لگی۔ قدرت کا فیصلہ دیکھو اس کے خوابوں کا شہزادہ آخر اسے مل ہی گیا۔ جو اس کے حُسن'

اس کے گیتوں اور اس کی دلکش آواز پر فریفتہ ہوا اور اسے اپنی رانی بنایا۔ دونوں ایک دوسرے سے بے حد محبت کرنے لگے' اس کے خوابوں کے شہزادے کا نام یوسف تھا۔ وہ ایک دوسرے کے لیے بنے تھے لیکن خوشیاں زیادہ دیر نہیں ٹکتیں اسی لیے وہ زیادہ دنوں تک رانی بن کے نہ رہ سکی۔ اس کا شہزادہ چلا گیا اور وہ اس کے فراق' اس کی جدائی میں گیت کہتی رہی اور اپنے یوسف کا انتظار' انتظار بس انتظار کرتی رہی۔

حبہ خاتون کی کہانی سن کر کمل نے کہا

سو وٹ (So What)

کیا مطلب سو وٹ (So What) پائل برہم ہوئی۔ تمہیں کیا لگتا ہے یہ کوئی من گھڑت کہانی ہے یہ ہسٹری ہے ہسٹری اور تم ہسٹری کو جھٹلا نہیں سکتے۔

اچھا بابا ٹھیک ہے لیکن ایک بات تو بتاؤ تمہیں یہ سب کیسے پتا ہے۔ کمل نے پوچھا۔

میں کئی دنوں سے حبہ خاتون کی لائف ہسٹری اور اس کی پوئٹری کا ترجمہ پڑھ رہی ہوں۔ پتا ہے ہمارے کیمپ کا خادم جو یہیں کا رہنے والا ہے مجھے کشمیری زبان سکھا رہا ہے۔ اب تو مجھے حبہ خاتون کی کچھ کچھ پوئٹری یاد بھی ہونے لگی ہے۔ پائل نے جواب دیا۔ وہ سامنے چٹان پر بیٹھی تھی کچھ دیر دھوپ میں رہنے سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ اس کے دونوں گالوں سے لالی چھلک رہی تھی۔ پھر وہ کہنے لگی کیا ہمارے نصیب میں یہ سب ریسرچ ادویات کی کھوج' کیریئر' فیوچر اس کے علاوہ کچھ نہیں لکھا ہے۔ ہم نے کیوں اپنی زندگیوں کو اتنا محصور کر کے رکھ دیا ہے کہ ہم اس کے علاوہ کچھ اور سوچ نہیں سکتے۔

بی پریکٹیکل پائل او سوری زون۔

تم کتنے کٹھور ہو کمل۔ تمہارے اس رویے سے میری محبت کم نہ ہو گی بلکہ اس چنگاری کو اور بھی ہوا لگ جائے گی۔ تمہیں پتا ہے حبہ خاتون کیا کہتی ہے۔ پھر وہ کشمیری میں کچھ گنگنانے لگی اور پھر بعد میں اس کا ترجمہ کمل کو یوں بتایا۔:

''میں اپنے سارے غم' اپنے ساز کے ذریعہ بیان کرتی ہوں

لیکن!

تم نے میری فریاد پر

کبھی توجہ نہ کی''

اب میں تم سے کہتی ہوں کمل' کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتے' تم ہی ہاں تم ہی تو میرے یوسف ہو۔

ان بلیو بل تم کتنی بدلی بدلی سی لگ رہی ہو۔ کہیں تم ان سب میں کھو کر اپنا وہ کام نہ بھول جاؤ جس کے لیے ہم اتنی دور سے آ کر ان جنگلوں اور پربتوں میں بھٹک رہے ہیں۔ ہمارے ساتھ آئے دوسرے لوگ اپنا اپنا کام جلدی ختم کر کے واپس لوٹ جانا چاہتے ہیں اور تم ہو کہ اپنا کام بھول کر رومنٹک ہوئے جا رہی ہو۔

چند روز بعد چاروں اور گونجتی خاموشی تھی اور اس کے سامنے کمل کھڑا تھا۔ دور افق کے غاروں سے سورج نکلنے کو تھا۔ وہ مبہوت ہو کر کمل کو گھور رہی تھی۔ اس کی پلکوں پر نمکین شبنم کے قطرے چمک رہے تھے۔ پھر وہ کہنے لگی۔

مت جاؤ مت جاؤ

مجھے چھوڑ کر مت جاؤ اس کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔

کس کے ساتھ کمل نے نہ چاہتے ہوئے بھی سوال کیا۔

حبہ خاتون کے ساتھ۔ اس کا یوسف بھی چلا گیا تھا اور وہ اس کی جدائی میں

روتی رہی، تڑپتی رہی اور ایک دن فراق اور جدائی کی اسی آگ میں بھسم ہوکر رہ گئی۔مت جاؤ آؤ یہیں اس خوب صورت وادی کے ان پُرسکون جنگلوں میں اپنی دنیا آباد کرتے ہیں، آباد کرتے ہیں اپنی محبتوں کی دنیا تم میرے دیوتا بن کر رہو اور میں تمہاری پجارن۔مت جاؤ۔

کمل کچھ دیر کے لیے اسے گھورتا رہا اور پھر بولا۔

دیکھو زون تم ہمیشہ یہیں رہنے والی تو نہیں ہو۔اپنی ریسرچ ختم کر کے شہر لوٹ آؤ، اپنے کام پر دھیان دو تمہارا سنہرا مستقبل تمہارا انتظار کر رہا ہے۔

مستقبل!

میرا فیوچر تو تم ہو۔

دیکھو زون ایک بات میں کلیئر کر دوں۔ میں پیار محبت او رشادی کے چکروں میں نہیں پڑنا چاہتا۔ہم صرف دوست ہیں۔اس سے آگے مجھ سے کوئی امید نہیں رکھنا۔اچھا کیمپ کے چند اور ساتھی میرے ساتھ واپس جا رہے ہیں اب تم بھی دوسرے ساتھیوں کے ساتھ جلدی لوٹ چلو۔

لوٹ چلوں!

کس کے لیے کس کی خاطر

پھر ہر طرف گونجتی خاموشیاں تھیں اور وہ ان گونجتی خاموشیوں میں جذب ہوتی رہی، تحلیل ہوتی رہی۔

برسوں گذر گئے پائل واپس نہیں لوٹی۔

کہتے ہیں وہ کئی دنوں تک جنگلوں میں اکیلے گھومتی پھرتی رہی۔حبہ خاتون کے گیت گاتی رہی اور دیوانی سی ہوگئی تھی۔پھر انہی جنگلوں میں پتا نہیں کہاں گم ہوگئی۔

ڈاکٹر کمل سینئر سائنٹسٹ برسوں اپنے کام میں بے حد مشغول رہا پھر جب ایک دن اسے برسوں کے بعد اپنا آپ یاد آیا تو خود کو اکیلا بے حد اکیلا پایا۔ تب وہ پھر کشمیر کے جنگلوں میں گھومنے کے لیے یا پھر اپنے آپ کو پانے کے لیے چلا آیا۔ یہاں کی صاف وشفاف فضاؤں سے لطف اٹھانے اور جنگلوں کے بیچ بہتے ندی نالوں کے قریب خیمہ زن ہونے کے لیے چلا آیا۔ پر اس کے دل کے کسی کونے میں پائل' جسے وہ زون بھی کہتا تھا' کی یاد موجود تھی۔ اس کے بارے میں سوچتے ہی اپنے ساتھ بڑبڑایا ٹریجک کوئین۔

پائل کو ٹریجک کوئین سمجھنے والا ڈاکٹر کمل خود بے حد تنہا تھا۔ محبتوں اور رشتوں سے عاری زندگی ایک سوالیہ نشان کی طرح اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اب وہ زندگی کے اس پڑاؤ پر تھا جہاں اس کی ہر رات اماؤس کی رات تھی' اب وہ زون'' چاند'' اور اس کی روشنی کے لیے ترس رہا تھا۔

وہ گھوڑے پر سوار جنگلوں کی اور چل رہا تھا اور اس کے ساتھ گھوڑے کی لگام تھامے اس کا خادم بھی تھا۔ کہ ایک سریلی آواز گونجی جیسے دور کوئی گا رہا ہو۔

یہ کیا ہے؟

خادم۔ جناب اس پر دھیان نہ دیجئے۔ کہتے ہیں کوئی برہن اپنے محبوب کی یاد میں برہ گاتی ہے۔ پر وہ کون ہے' کہاں رہتی ہے' کہاں سے آتی ہے اور کدھر جاتی ہے' کسی کو کچھ نہیں پتا اور نہ کسی نے اسے اب تک دیکھا ہے۔

ٹھہرو! رُک جاؤ' ڈاکٹر کمل نے خادم سے کہا اور گھوڑے سے نیچے اتر کر گیت کو غور سے سننے کی کوشش کرنے لگا' اسے برہ کے بول جانے پہچانے لگے اور آواز بھی مانوس سی لگنے لگی۔ پہلے وہ دھیرے دھیرے پھر تیز تیز دوڑتا' لڑکھڑاتا

ہوا بھاگنے لگا اوران بے سمت صداؤں کا پیچھا کرنے لگا کبھی نیچے وادی سے تو کبھی جنگل میں گیت کے بول:

ناد لایئے میٔانہِ یُوسفوولو

(میں تم کو پکاروں' میرے یوسف کہاں ہو چلے آو)

چاروں اور گونج رہے تھے۔

☆☆☆

گرتی دیوار کا محافظ

اُس کا جیون سُر ساگر تھا۔

اُس کا اصل نام عبدالعزیز تھا مگر وہ تب بے حد خوش ہوتا جب اُسے کوئی عزیز ربابی کے نام سے پکارتا۔ ویسے بھی وہ آس پڑوس کے علاقوں میں عزیز ربابی کے نام سے ہی مشہور تھا۔ مگر یہ نام اُسے یوں ہی نہیں ملا تھا بلکہ رباب جیسے ساز کو بجانے میں مہارت حاصل کرنے پر ملا تھا۔ گھر میں غربت ہونے کی وجہ سے وہ بچپن میں پڑھائی نہ کر سکا بلکہ چند دن سکول جانے کے بعد اُسے گھر والوں نے ایک درزی کے پاس بٹھا دیا تاکہ کوئی چھوٹا موٹا سلائی کا کام سیکھ سکے۔ اُس درزی کے پاس کبھی کبھار ایک بزرگ شخص آتا جس کے ساتھ بڑے سے تھیلے میں رباب کا ساز ہوتا بچپن میں عبدالعزیز نے اس بزرگ شخص کے سامنے ضد کی مجھے یہ ساز بجا کر سنا دے۔ بزرگ شخص نے بچے کا شوق دیکھ کر اس کی یہ ضد پوری کی اور چند دھنیں سنا دیں اور یوں عبدالعزیز رباب کی آواز سے آشنا ہوا اور رباب کے تار اس کے دل کے تاروں کے ساتھ جڑ گئے۔ بس پھر کیا تھا اس نے یہ ساز سیکھنے کی ٹھان لی اور بزرگ شخص نے اُسے یہ ساز سکھانے کے لیے رضامندی ظاہر کرتے ہوئے ہدایت کی کہ فن کی مشق اور اس کا ریاض اگر دل سے کیا جائے تو فن، فن نہیں رہتا بلکہ عبادت بن جاتا ہے۔

ہمیشہ اس بات کا خیال رکھنا۔ بزرگ نے تاکید کی۔

یوں عبدالعزیز نے رباب کا ساز بجانا سیکھا اور کافی ریاض اور محنت کے بعد مہارت حاصل کی۔ بڑا ہو کر فن کاروں کی ایک جماعت میں شامل ہوا اور یوں مختلف محفلوں میں ساز بجانے کا موقع ملتا رہا۔ تھوڑا بہت نام ملا اور پیسے بھی۔ پھر عزیز ربابی کی شادی مغلی سے ہوئی جو اس کی تعبدار ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے فن کی بھی قدر دان نکلی۔ وفا شعار دیوی نے عزیز ربابی کا ساتھ دیا اور یوں دونوں زندگی کی منزلیں طے کرتے گئے۔

مغلی روز صبح عزیز ربابی کو اپنے ہاتھوں سے تیار کرتی جیسے کسی سکول جاتے بچے کو تیار کیا جاتا۔ مغلی اسے اپنے ہاتھوں سے صدری پہناتی اس کی بھلائیں لیتیں اور دعائیں دے کر رخصت کرتی۔ عزیز ربابی گانے والوں کی جماعت کے ساتھ شادی بیاہ کی تقریب میں مہندی رات کو چھکری اور روف گاتا اور اپنے ساز کی پُرکشش صداؤں سے ہر ایک کو مدہوش کرتا۔ لوگ اس کی تعریفیں کرتے اور اس کے فن کو خوب سراہتے۔ اس کی جماعت کو کبھی کبھار ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر ریکارڈنگ کے لیے بھی بلایا جاتا۔ وہ اپنے فن کا مظاہرہ کرتے اور مشہور چھکری اور روف سے سامعین و ناظرین کو محظوظ کرتے۔ جب عزیز ربابی کے بچے بڑے ہونے لگے اس نے بے حد کوشش کی کہ اُس کے بچے بھی اس فن کو سیکھ لیں لیکن جب بچے بڑے ہوئے تو انہوں نے پڑھائی ختم کر کے نہ صرف الگ کام دھندہ شروع کیا بلکہ اپنے باپ سے بھی اصرار کیا کہ وہ اس گانے بجانے کے فن کو چھوڑ دے اس بات پر ان کی ماں مغلی غصہ ہو جاتی اور بچوں کو ڈانٹتے ہوئے کہتی۔

ارے کم بختو! انہوں نے اس فن کے سہارے عزت کمائی، نام کمایا اور گھر کی

روٹی کا انتظام کیا اور آج تم انہیں اس فن کو چھوڑنے کے لیے کہتے ہو جو انہیں اپنی جان سے بھی پیارا ہے اور جوان کی پہچان ہے۔

پر اب وقت بدل چکا تھا' زمانہ بدل چکا تھا لوگ بدل چکے تھے اور لوگوں کے مزاج اور ان کی پسند بدل چکی تھی نئی نسل چھکری اور روف کے دلدادہ نہ تھی اس بات کو عزیز ربابی بہت شدت کے ساتھ محسوس کرنے لگا۔ وہ کبھی کبھی چڑ جاتا اور مغلی سے غصے بھرے لہجے میں کہتا۔

سنو۔ مغلی سنتی ہو۔

لوگوں نے صوفیوں کے کلام کو سننا کم کر دیا ہے اب تو زیادہ تر وہ بازاری شاعری سننا پسند کرتے ہیں سن رہی ہو نا اب چھکری اور روف کے قدر دان کم ہو رہے ہیں۔ پتہ نہیں لوگوں کو کیا ہو گیا ہے اپنی زبان بھولتے جا رہے ہیں۔ غیروں کی موسیقی سننے کو ترجیح دیتے ہیں۔ جس میں نہ ہم ہے نہ ہمارے احساس کی خوشبو۔

پھر ایک شام کو عزیز ربابی اور ان کی منڈلی ایک صاحب کے یہاں جس کی بیٹی کی مہندی رات میں انہیں گانا تھا پہنچے تو اُس صاحب نے اُن سے معذرت مانگی اور چند روپے اُن کے ہاتھ میں رکھے اور معذرت کرتے ہوئے کہا۔

وہ ..... وہ کیا ہے کہ بچوں نے چند نئے لڑکوں کو گانے بجانے کے لیے بلایا ہے۔ آ...... آپ....... آپ تو جانتے ہیں آج کل کے بچوں کی پسند کچھ اور ہی ہے۔

عزیز ربابی اور اس کے ساتھیوں کو بے حد برا لگا جیسے کسی نے انہیں طمانچہ مارا ہو' انہوں نے وہ روپے وہیں پھینک دیئے اور واپس چلے آئے۔ گھر پہنچتے ہی عزیز ربابی کی بیوی مغلی سمجھ گئی کہ اس کا شوہر بے حد غصے میں ہے اس نے جلدی جلدی

نمکین چائے کی پیالی اس کے سامنے رکھ دی اور ساتھ ہی پوچھ بیٹھی۔

کیوں جی بے حد غصے میں لگ رہے ہو۔ کیا بات ہے کیا ہوا۔

ارے یہ آج کل کے چھورے اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہیں۔

انہیں کیا لگتا ہے کہ یہ ہم سے بازی مار لیں گے کبھی نہیں، ہرگز نہیں، ارے ہم تھوڑی ہی ان کی طرح نقلی دھنوں پر گاتے ہیں اپنے جگر کا خون جلاتے ہیں تب جا کے ایک نغمہ تیار ہوتا ہے اور پھر ساز اور آواز کی خوشبو کے ساتھ لوگوں کی روح تک اُتر جاتے ہیں۔ اِن کا کیا ہے اِن کے پاس تو وہ...... کیا کہتے ہے اُسے...... عجیب ساز ہے یہ وہی بجاتے ہیں، پتہ نہیں ایک بٹن دبانے سے نہ جانے کیسے تمام سازوں کی آوازیں کہاں سے نکل آتیں ہیں۔ رباب، سارنگی، سنتور، ستار سبھی سازوں کی آوازیں نکل آتی ہیں۔ مگر اصل ساز تو اصل ہی ہیں نا۔

جی چھوڑیئے بھی غصہ نہ ہو جائے۔

مغلی نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

دیکھئے غصہ تھوک دیجئے، دیکھئے نا چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ پہلے چائے پی لیجئے۔

عزیز ربابی اچھی طرح سمجھتا تھا کہ اب اس کے فن کے قدردان غائب نہ صحیح لیکن کم ضرور ہو گئے ہیں۔ اب اس کے دل میں دھیرے دھیرے اُداسی اور مایوسی گھر کرنے لگی۔

ایک دفعہ وہ کسی ہال میں اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ چھکری اور روف گا رہا تھا۔ صفِ سامعین میں کئی اعلیٰ وذی وقار شخصیات اور لوگوں کی اچھی خاصی تعداد تھی۔ پورا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا مگر گانے کی طرف کسی کی بھی توجہ نہ تھی بلکہ سبھی

آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ٹھاٹھیں مار رہے تھے، ہنس رہے تھے، لیکن عزیز ربابی اور اس کے دوسرے ساتھی برابر اپنے فن کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ نغمہ ختم ہوتے ہی لوگوں نے زور زور سے تالیاں بجائیں۔ عزیز ربابی کو اِن تالیوں کی گونج دل پر کوڑے برساتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ آگ بگولا ہو کر گھر واپس لوٹا اور وہ رباب جسے وہ جان سے بھی زیادہ پیار کرتا تھا زور سے زمین پر پٹک دیا یہاں تک کہ اس کے کچھ تار کھل گئے، کچھ ٹوٹ گئے۔ مغلی یہ دیکھ کر پریشان ہوئی پر کچھ پوچھنے کی ہمت جُٹا نہ سکی۔ عزیز ربابی چلایا۔

اگر کوئی میرا ساتھی یا کوئی اور بھی میرے بارے میں پوچھے تو کہہ دینا میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور کمرے کا دروازہ زور سے بند کر دیا۔ عزیز ربابی بے حد مایوس ہو کر کئی دن تک کمرے میں پڑا رہا۔

پھر دھڑکنیں جیسے دھڑکنا بھول گئیں۔ زندگی بے رنگ، بے نور، بے آہنگ ہو گئی۔ کسی چیز میں جی نہیں لگتا تھا۔ عزیز ربابی نے یہ سوچا بھی نہ تھا کہ اس کی زندگی میں ایسے دن بھی آئیں گے اس کے اندر اندر ہی کچھ چُب رہا تھا۔ جیسے کوئی گہرا گھاؤ کریدا جا رہا ہو۔ مغلی روز صبح عزیز ربابی کو صدری پہنانے کے لیے آتی اور رُندھی ہوئی آواز میں پوچھتی۔

آج کہیں جانا ہے کہ ......

تو عزیز ربابی نفی میں سر ہلاتا اور لیٹے لیٹے کروٹ بدلتا۔ وہ زیادہ وقت گذرے دنوں کو یاد کرنے میں گذارتا۔ بیتے دنوں کی خوب صورت یادیں اُسے قدرے راحت بخشتی اور اسے وہ خوب صورت شب و روز یاد آتے جب اچھی خاصی محفلیں سجتیں ان محفلوں میں اعلیٰ پائے کا صوفیانہ کلام گایا جاتا۔ صف سامعین و

حاظرین میں اعلیٰ ذوق رکھنے والے لوگ ہوتے جو ساز اور آواز کی داد تحسین دیتے ہوئے نہیں تھکتے اور ساری محفل پر عجیب کیفیت طاری ہو جاتی ۔کبھی کبھار یہ خوب صورت محفلیں کسی صوفی بزرگ کی یاد میں بھی سجتیں ۔مگر اب.....اب صرف ان دنوں کی یادیں رہ گئیں تھیں۔

کئی روز گھر سے نہ نکلنے پر اس کے ساتھی اُسے پوچھتے ہوئے اُس کے گھر بھی آئے لیکن وہ کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے اُنہیں ٹال دیتا۔اب وہ اکثر وقت گھر میں یا پھر آنگن میں ٹہلتے ہوئے یا سوچتے ہوئے گذارتا۔

پھر ایک دن گھر کے آنگن میں عزیز ربابی پتہ نہیں کیا سوچ رہا تھا اُس کی نظر گھر کے برآمدے پر پڑی جہاں اُس کا پانچ سال کا پوتا رباب اور اُس کے ٹوٹے تاروں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔عزیز ربابی اُس کے پاس گیا تب وہ معصوم اپنے دادا جی سے پوچھ بیٹھا۔

''دادا جی یہ کیسے بجتا ہے''۔

عزیز ربابی نے اُس کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ پھیرا اور اُسے گھورنے لگا۔وہ معصوم پھر پوچھنے لگا۔

''دادا جی بتایئے نا یہ کیسے بجتا ہے''۔

تم سنو گے ہاں بیٹا بولو تم سنو گے۔

ہاں ہاں دادا جی۔

عزیز ربابی نے جلدی جلدی رباب کے کُھلے ہوئے تار باندھے اور ٹوٹے ہوئے تار جوڑ دیئے اور پھر زور زور سے رباب کو بجانے لگا۔ٹھیک اسی طرح جیسے کئی دنوں کا پیاسا اپنی پیاس ٹھنڈے پانی سے گھٹا گھٹ پی کر بجھا رہا ہو۔دل نے دھڑکنا

شروع کیا اور رگوں میں جما ہوا لہو پھر دوڑنے لگا۔ گھر کے سبھی لوگ ساز کی آواز سن کر جمع ہو گئے۔

عزیز ربابی مدہوش ہو کر آنکھیں بند کر کے ساز بجا رہا تھا اس کی آنکھوں سے اشک رواں تھے اور انگلیوں سے خون ٹپک رہا تھا۔ کیونکہ وہ رباب بِنا مضراب (ساز بجانے کا چھلا) کے بجا رہا تھا۔

☆☆☆

کرب زار

کیا سوچ رہے ہو؟
سوچ نہیں رہا بلکہ دیکھ رہا ہوں
اچھا تو کیا دیکھ رہے ہو؟
خواب.......!
خواب! کھلی آنکھوں سے
ہاں کھلی آنکھوں سے
کس چیز کے خواب دیکھ رہے ہو
آنے والے دنوں کے
مت دیکھو
کیوں؟
خواب ٹوٹیں گے تو ٹوٹے کانچ کی طرح آنکھوں میں چبھنے لگیں گے
نہیں ایسا نہیں ہوگا
ایسا ہی ہوگا
آپ ایسا کیسے کہہ سکتے ؟
یہ میں نہیں کہتا میرا تجربہ کہہ رہا ہے

کیا آپ نے کبھی خواب دیکھے تھے؟

ہاں

کیا پھر وہ ٹوٹ گئے

ہاں

کب کی بات ہے یہ

تقریباً سولہ سترہ سال پہلے کی

کہاں

وہ جو سامنے انصاف کا مندر دیکھ رہے ہو وہیں پر۔ بوڑھے نے لڑکے کو سامنے عدالت کی عمارت کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔ آخر ہوا کیا تھا کچھ کھل کر تو بتائیے لڑکے نے تجسس سے پوچھا۔

یہ سب جاننے کی تمہاری ابھی عمر نہیں۔ تمہاری عمر کتنی ہوگی۔ زیادہ سے زیادہ گیارہ، بارہ سال بوڑھے نے کہا۔

ہاں آپ ٹھیک کہتے ہیں لڑکے نے جواب دیا لیکن میں جاننا چاہتا ہوں۔

نہیں بالکل نہیں بوڑھے نے نفی میں جواب دیا۔

خاموشی صرف برستی بارش کا شور......

مختصر وقفے کے بعد لڑکا سوالیہ انداز میں کہنے لگا۔

اچھا یہ بارش کب تھمے گی؟

تھمے گی ضرور تھمے گی۔ انسان، وقت اور موسم ایک جیسے نہیں رہتے۔ بوڑھے نے جواب دیا اچھا ٹھیک ہے جب تک یہ بارش نہیں رُکتی تب تک تو بتائیے کہ آخر آپ کے خوابوں کے ساتھ کیا ہوا میں وعدہ کرتا ہوں جوں ہی بارش رُکے گی میں یہاں سے

چلا جاؤں گا۔لڑکے کے معصوم چہرے نے بوڑھے پر اثر کیا اور بوڑھا بولا چلوٹھیک ہےتو سنو۔

میں ایک مزدور تھا۔محنت مشقت کر کے روٹی کماتا۔ایک بوڑھی عورت تھی جو کافی روپے پیسے والی تھی لیکن اس کا آگے پیچھے کوئی نہ تھا۔خاوند نہ اولاد۔میں اس کے باغوں میں باغبانی کرتا اور بدلے میں وہ تھوڑے پیسے دیتی تھی۔میں اور میری بیوی اسی قلیل آمدنی پر گذارا کرتے۔ہمارا ایک چھوٹا بیٹا تھا جسے ہم دونوں میاں بیوی بے حد چاہتے تھے وہ ہمارے مستقبل کا ایک واحد سہارا تھا اور ہم نے بھی بہت خواب دیکھ رکھے تھے۔جب وہ میرا بیٹا تمہاری عمر کا ہوگیا ایک دن اچانک بیمار ہوگیا' کافی علاج معالجے کے بعد ڈاکٹروں نے بتایا کہ اس کا آپریشن کرنا پڑے گا۔مجھ سے جتنی رقم طلب کی گئی وہ میرے اختیار سے باہر تھی۔میں نے بیوی کے کہنے پر بوڑھی مالکن سے روپے ادھار مانگے مگر بوڑھیا نے صاف انکار کیا۔وہ بڑی لالچی بوڑھیا تھی۔حالانکہ اس کے پیر قبر میں لٹک رہے تھے۔لالچی بوڑھیا جہنم میں جائے۔

بوڑھے نے زور سے سڑک کی طرف تھوکا۔جب اور کوئی صورت نظر نہ آئی تو ایک رات میں چپ کے سے بوڑھیا کے کمرے میں داخل ہوا۔میں جانتا تھا بوڑھیا اپنے روپے پیسے کمرے کی کس الماری میں رکھتی تھی۔میں ابھی اس الماری سے پیسے نکال ہی رہا تھا کہ وہ بوڑھیا نیند سے جاگ گئی۔میں گھبرا گیا اس سے پہلے کہ بوڑھیا چیختی میں نے ٹیبل پر رکھا گلدان اٹھایا اور اس کے سر پر ہلکے سے دے مارا اور وہ بے ہوش ہوگئی۔

تو کیا آپ کے بیٹے کا علاج اُن پیسوں سے ہوگیا جو آپ نے چرائے تھے۔لڑکے نے پھر سوال کیا۔

نہیں۔اس سے پہلے ہی مجھے پولیس نے دھر لیا۔چوری اور قتل کے الزام میں۔

قتل۔لڑکے نے چونک کر کہا۔

ہاں قتل۔ بڑھیا مرگئی تھی، مجھے سامنے والی اسی عدالت میں پیش کیا گیا میں نے عدالت میں چلا چلا کر کہا کہ یہ روپے میں نے اپنے لخت جگر کے علاج کے لیے چرائے ہیں۔اپنے عیش کرنے کے لیے نہیں۔ میں رو رو کر چلایا اگر میرے بیٹے کا علاج نہ ہوا تو وہ مرجائے گا۔مگر میری ایک نہ سنی گئی مجھے چودہ سال کی سزا سنائی گئی۔

اور آپ کا بیٹا؟

وہ ہسپتال کے بیڈ پر ایڑیاں رگڑتے رگڑتے مرگیا۔

اور آپ کی بیوی؟

وہ اپنے لخت جگر کی موت اور غربت زیادہ دن برداشت نہ کرسکی۔ایک سال بعد مجھے جیل میں یہ خبر ملی کہ وہ اللہ کو پیاری ہوگئی۔تو کیا آپ چودہ سال جیل میں رہے؟

نہیں تیرہ سال اور چھ مہینے، میرے چھ مہینے کی سزا معاف کردی گئی۔

اب آپ کیا کرتے ہیں؟

مین چوک میں جو شاد بلڈنگ ہے اس کے نیچے بیٹھا رہتا ہوں اور لوگ آ کر پیسے ڈال دیتے ہیں۔

اچھا تو بھیک مانگتے ہیں آپ!

نہیں نہیں میں نہیں مانگتا لوگ خود ڈال دیتے ہیں۔شاید اپنے گناہوں

کا بوجھ کم کرنے کے لیے۔

ارے دیکھئے' لڑکا اچانک چلایا۔ دیکھئے بارش تھم گئی۔

آپ سچ کہتے تھے کہ انسان' وقت اور موسم ایک جیسے نہیں رہتے ہیں۔

اچھا۔ اچھا تو میں چلتا ہوں۔ مجھے گھر جانا ہے۔ میرے ابّو امّی پریشان ہو رہے ہوں گے۔ لیکن میں ایک وعدہ کرتا ہوں کہ میں آپ سے مین چوک میں ضرور ملنے آیا کروں گا آخر میں بھی تو آپ کے بیٹے جیسا ہی ہوں دیکھئے دُکھی مت ہو جایئے میں پھر ملنے آؤں گا

لڑکے نے اپنا کرکٹ کا بلّا اٹھایا اور پسینجر شیڈ سے جہاں یہ دونوں بارش سے بچنے کے لیے بیٹھے تھے' بلے کو لہراتا ہوا سڑک پر نکل آیا۔ بوڑھے نے آواز دی۔

دیکھو سنبھل کر جانا اور سدھے گھر ہی چلے جانا۔ دوستوں کے ساتھ پھر مت کھیلنے لگ جانا' بوڑھا فکرمندی سے آواز دے رہا تھا۔ آپ فکر نہ کریں میں سیدھے ہی گھر جاؤں گا اور آپ سے پھر ملنے آؤں گا۔

لڑکا جلدی جلدی سڑک پار کرنے لگا کہ ایک تیز رفتار گاڑی آئی اور لڑکے کو کچل کر چلی گئی۔

☆☆☆

میں پریشان ہوں ابھی

ایلس نے ونڈر لینڈ میں کیا کیا دیکھا____؟
شارک، آئس ایج اور میڈ اگاسکر فلموں میں سے کون سی زیادہ اچھی ہے؟
ہیری پوٹر کا نیا کارنامہ کیا ہو سکتا ہے____؟
بچے آنگن میں کھیلتے ہوئے آپس میں یہی باتیں کر رہے تھے۔

غلطی میری ہے میں نے کبھی بھی انہیں اپنے پاس بٹھا کر الف لیلیٰ، ہزار داستان، اکبر نندن، بیتال پچیسی یا پنچ تنتر کی کہانیاں نہیں سنائیں اور نا ہی خود کوئی ایسی کہانی لکھی جس سے بچے خوش ہوتے۔ شاید اسی لیے انہیں ان فلموں کا سہارا لینا پڑا۔ کیونکہ انسان کہانیوں کے بغیر جی نہیں سکتا۔ اسی لیے وہ ہر لمحہ سچی جھوٹی کہانیاں گڑھتا رہتا ہے اور پھر ان کہانیوں میں خود کو اوروں سے بہتر تصور کرتا رہتا ہے۔

یہی سوچتے سوچتے میں نے کروٹ بدلی۔ میری نظر ٹیلی ویژن پر پڑی میں اٹھا اور ٹیلی ویژن آن کیا۔

ایک شخص دو بچوں کو اپنے بازوؤں میں اٹھا کر بھاگ رہا تھا اور پیچھے کچھ تباہی کے منظر تھے یہ بڑی سی تصویر ایک بڑے سکرین پر تھی اور اس کے سامنے دو عورتیں آپس میں بحث و مباحثہ کر رہی تھیں۔

میں نے چینل بدلا

نیم عریاں تھرکتے جسم۔

نام ریلٹی شو

میں نے چینل بدلا

کراچی جل رہا ہے۔

میں نے پھر چینل بدلا

شام پر حملے کی تیاریاں۔

میں نے آنکھیں بند کیں اور سوچنے لگا' میں اور میرا قلم تب بھی خاموش تھا جب ایک طاقتور ملک نے دوسرے ملک میں بے جا مداخلت کی' بے تحاشہ خون بہایا اور وہاں کے حاکم کو سولی پر لٹکایا۔

میں اور میرا قلم اب بھی خاموش ہے۔

وہی مصلحت پسندی.....

میں نے پھر چینل بدلا

پیٹرول چار روپے تیس پیسہ اور مہنگا ہو گیا۔

میں نے پھر چینل بدلا۔کوئی فلم چل رہی تھی۔ ایک اداکار کو دفتر میں قلم گھِساتے ہوئے دکھا رہے تھے۔ مجھے خیال آیا بالکل ایسے ہی میں بھی دفتر میں قلم گھِسا تا رہتا ہوں۔ ہر بیس منٹ کے بعد میرا باس مجھے نیا کام دیتا ہے اور ہر بیس منٹ کے بعد اپنا ہی پچھلا حکم بدل کر نیا حکم صادر کرتا ہے۔ کہتا ہے۔

بھئی نبیل۔

یہ صاحب منسٹر صاحب کے خاص آدمی ہیں۔ ان کا کام جلدی ہو جانا چاہیے۔

صبح سے کمشنر صاحب نے دو دفعہ فون کیا ہے۔ وہ پھر فون کریں گے تو میں کیا جواب دوں گا۔ جلدی انفارمیشن میل کر دو۔

سارے کام رہنے دو۔ یہ Data ابھی فیڈ ہونا چاہیے۔

دفتر سے نکلنے سے پہلے ایک بار ضرور مجھے ذہنی اذیت دیتا ہے۔ غالب یا اقبال کے شعر پڑھتا ہے اور پھر ان کی ایسی الٹی سیدھی تشریح کرنے بیٹھتا ہے کہ میری روح تک کانپ اٹھتی ہے اور مجھے اُس پر ترس آتا ہے اور ساتھ ہی برصغیر کے ایک مشہور ادیب کے یہ جملے یاد آتے ہیں:

''ہم اکثر ایسے لوگوں کو دیکھتے ہیں جو اپنے عہدے یا پھر اپنی
کرسی کی وجہ سے بہت کچھ نظر آتے ہیں۔ لیکن اگر ان سے
یہ عہدے یا کرسی چھین لی جائے تو وہ کچھ بھی نہیں ہوتے''۔

میں اس کے سامنے ہاتھ جوڑے جی ہاں، جی ہاں، بالکل، بالکل، ضرور، ضرور کہتا رہتا ہوں۔

بس وہی مصلحت پسندی.....

میں اٹھا اور ٹیلی ویژن بند کر دیا۔ پھر واپس لیٹ گیا۔

ثنا کمرے میں آ گئی۔

اتنے اچھے موسم میں آپ کیوں ایسے کمرے میں کھڑکیاں بند کر کے بیٹھے ہیں۔ باہر جا کر دیکھئے تو موسم کتنا خوشگوار ہے۔

نہیں نہیں، کھڑکیاں مت کھولو۔

میں نے ثنا کو روکا اور ہاں مجھے باہر کہیں نہیں جانا۔ میرا من نہیں کر رہا کہ کہیں جاؤں۔

میں ثنا کو کیسے سمجھاؤں کہ میں باہر کیوں نہیں جانا چاہتا۔ میں تو اب بے کیف زندگی گذار رہا ہوں۔ ایک دم بے کیف زندگی۔ ثنا کو معلوم نہیں کہ دنیا میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ ہر طرف تناؤ' بربریت' ظلم و تشدد اور دل دہلا دینے والے جرائم۔ یہ سب باتیں مجھے بے حد پریشان کر دیتی ہیں۔ میں اب تناؤ اور گھبراہٹ کے گھیراؤ میں رہتا ہوں۔ دفتر کی پریشانیاں اور بے ڈھنگ کام کرنے کے طریقے مجھے اور زیادہ پریشان کر دیتے ہیں۔ میرے اعصاب پر ہر پل یہی سب کچھ سوار رہتا ہے۔ جس سے میں گھبرایا گھبرایا سا' سہما سہما سا رہتا ہوں۔ رشتوں سے کٹ کر رہ گیا ہوں۔ دوست احباب سے بیزار رہتا ہوں۔ پر میں کسی سے کچھ نہیں کہتا۔ نا ہی ثنا سے کیونکہ یہ میرے وجود کا' میرے حصے کا کرب ہے۔ میرے اندر کی آگ اور اس آگ میں جھلسنا ہی میرا مقدر ہے اور اب میرے اندر یہ سارا خلاء یہ سارا ویکوم بڑھتا جا رہا ہے۔

میں چونک پڑا۔ موبائیل کی گھنٹی بج رہی تھی۔ میں نے دیکھا میرے ایک قلم کار دوست کا فون تھا۔ میں نے کاٹ دیا۔ اخبار کہاں ہے۔

جی وہ آج اخبار والا نہیں آیا' ثنا نے جواب دیا۔

نبیل بھائی۔

نبیل بھائی۔

باہر سے آواز آنے لگی۔

دیکھو! میں نے ثنا کو دبی آواز میں سمجھاتے ہوئے کہا۔

جو کوئی بھی ہے باہر سے ہی ٹال دو۔ کہہ دو کہ میں گھر میں نہیں ہوں۔

شیں...... شیں....

میں اُچھل پڑا۔ پریشر کُکر کی سیٹی تھی۔

ثنا پھر آ گئی۔ وہ کیا ہے کہ آپ کو لالچوک تک جانا پڑے گا۔ اماں جی کی دوائیاں ختم ہوگئی ہیں اور وہیں سے رات کے کھانے کے لیے سبزی بھی لیتے آیئے گا۔ ہاں ندرو لے آیئے گا۔ آج ندرو پکاتے ہیں۔

میں بڑی بے دلی سے اٹھا کیونکہ میں یہ اتوار کی چھٹی گھر میں گذارنا چاہتا تھا۔ ویسے بھی باہر نکلنے پر مجھے عجیب سا خوف اور دہشت محسوس ہونے لگتی ہے۔ گاڑیوں کا شور، لوگوں کی بھیڑ مجھے اور بھی زیادہ پریشان کر دیتی ہے۔

باہر گلی سے گذرتے ہوئے مجھے کتوں پر نظر پڑی۔

انہیں مارنے کی کوئی جرأت نہیں کرتا۔ لیکن ہمیں.....

میں سڑک پر پہنچا تو دیکھا زندگی معمول کے مطابق رواں دواں تھی۔ گاڑیاں اور لوگ حرکت میں تھے۔ بس سٹاپ پر کنڈیکٹر چلا چلا کر لالچوک لالچوک پکار رہا تھا اور پھر کچھ دیر بعد میں لالچوک میں تھا۔ میں نے اماں کے لیے دوائیاں خریدیں اور ثنا کے کہنے پر ندرو بھی۔ میری آنکھوں کے سامنے اس شخص کی تصویر بار بار گھوم رہی تھی جو دو دو بچوں کو بازوؤں میں اٹھائے ہوئے محفوظ جگہ کی تلاش میں بھاگ رہا تھا۔

آخر......

آخر کہاں گیا ہوگا....۔

اُس کا کیا قصور تھا۔

اُس کا شاید قصور بھی ہو۔ لیکن اس کے معصوم بچوں کا کیا قصور رہا ہوگا۔

بڑے ائیر کنڈیشن ہال میں ہزاروں روپے کے سوٹ پہنے ہوئے مٹھی بھر افراد کس طرح لاکھوں کروڑوں لوگوں کی قسمت کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔

میں چاہتا ہوں ماتم کروں۔لیکن نہیں..... نہیں..... نہیں....

میں ایسا بھی نہیں کر سکتا۔

ہمارا سب سے بڑا المیہ شاید یہی ہے کہ ہم کھُل کر ایک دوسرے کے لیے ماتم بھی نہیں کر سکتے۔

میں اپنے آپ کو بے بس محسوس کر رہا ہوں۔جیسے میری ساری طاقت چھین لی گئی ہو۔بالکل میرے قلم کی طرح۔

میں یوں ہی گھبرایا ہوا آگے بڑھا کہ میری نظر اخبار فروش پر پڑی۔میں نے آگے بڑھ کر اخبار ہاتھ میں اٹھایا۔

ایک قصبے میں تین معصوم شہریوں کو ہلاک کر دیا گیا۔

واقعے کی تحقیقات کا حکم۔

میرے ہاتھ پھر کانپنے لگے۔میں اور بھی زیادہ گھبرانے لگا۔کانپتے ہاتھوں سے جیب سے چند سکے نکالے اور اخبار فروش کی ہتھیلی پر رکھ دیئے۔میں نے پھر اخبار کھولا وہی سرخی دوبارہ پڑی اور پھر آگے بڑھا۔میں چاہ رہا تھا کہ اپنے خیالات پر اپنی گھبراہٹ پر' اپنی بے بسی پر اور اپنے کانپتے ہاتھوں پر قابو پا سکوں پر ایسا کرنا ممکن نہ تھا۔پتہ نہیں کیوں میرے قدم تیز ہو گئے میں وقت ضائع کیے بغیر بس سٹاپ پر آ گیا اور جلدی جلدی گاڑی میں چڑھا۔ایک شخص نے خود کو ایک طرف سرکاتے ہوئے میرے لیے جگہ بنا دی لیکن میں سیٹ پر ٹھیک سے نہیں بیٹھ پایا۔جیسے میں سیٹ پر نہیں بلکہ کانٹوں کے فرش پر بیٹھا تھا۔ہر تھوڑے وقفے کے بعد میں کھڑا ہو جاتا اور پھر بیٹھ جاتا' ٹانگوں کو بے وجہ ہلانے لگتا' پھر کھڑا ہو جاتا' پھر سے بیٹھ جاتا۔میری ایسی حرکتوں سے دوسرے مسافر مجھے گھورنے لگے۔میں ان سب کو کیسے سمجھاؤں کہ میں اس

قدر بے چین کیوں ہوں۔ مجھے تو جلدی ہے۔گھر جانے کی بے حد جلدی۔میں ان سب سے کیسے کہوں کہ مجھے گھر جا کر چھپنا ہے۔ہاں....ہاں چھپنا ہے۔بالکل اُسی طرح جیسے چوہا اپنے بل میں جا کر چھپتا ہے۔

پر پتہ نہیں کیوں واپسی کا یہ سفر طویل سے طویل تر ہوتا گیا۔میں بے صبری سے اپنے سٹاپ کا انتظار کر رہا تھا۔میری بے صبری دیکھ کر بغل والے شخص نے مجھ سے دریافت کیا کہ مجھے کہاں جانا ہے۔پہلے تو مجھے اس کی آواز صاف سنائی نہیں دی کیونکہ میرے اندر پہلے ہی بہت سارا شور بپا تھا۔لیکن جب اُس نے ایک بار پھر اونچی آواز میں پوچھا۔

جناب آپ کو کہاں جانا ہے۔تو میں نے جگہ کا نام بتایا۔

پھر مجھے بیچ راستے میں گاڑی سے اتار دیا گیا۔

کیونکہ میں گھر کی طرف نہیں بلکہ غلط گاڑی میں بیٹھا مخالف سمت کی اور سفر کر رہا تھا۔

☆☆☆

شراپ

گرمی کی دوپہر تھی اور شاہراہ خاموش تھی۔ سورج سوا نیزے پر چمک رہا تھا۔ خاموش شاہراہ کے دونوں اطراف کچی دھان کے کھیت دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ کبھی کبھار کوئی تیز رفتار گاڑی آتی اور اس خاموش کو چیر کر گذر جاتی۔

اجیت سنگھ کو تھوڑی پیاس محسوس ہوئی جیسے اُس کے حلق میں کانٹے چُبھے ہوں۔ اس نے اپنی رائفل کاندھے پر لٹکا دی اور پانی کی بوتل کھول کر اپنے گلے کو تر کر لیا۔ البتہ کھڑے کھڑے رہنے سے ابھی اسے کوئی تھکاوٹ محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ کیونکہ اس طرح کھڑے رہ کر پہرہ دینا اُس کا معمول بھی تھا اور ڈیوٹی بھی۔ پچھلے کئی برسوں سے وہ گھاٹی میں اپنی ڈیوٹی دے رہا تھا۔ اس کے دوسرے فوجی ساتھی اسی طرح تھوڑی تھوڑی مسافت پر پہرہ دے رہے تھے گھاٹی میں حالات خراب رہنے کی وجہ سے انہیں ہر وقت چوکنا رہنا پڑتا مگر ان خراب حالات کے باوجود صرف ایک چیز تھی جو اجیت سنگھ کو ہمیشہ اطمینان دیتی تھی وہ یہ کہ اُس نے گھاٹی کے مظلوم لوگوں میں کبھی کسی پر کوئی ظلم نہ ڈھایا تھا یہاں تک کہ کسی کو ایک تھپڑ تک نہیں مارا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ہمیشہ اپنے آپ میں ایک اطمینان محسوس کرتا تھا اور کبھی کبھی چھٹیاں ملنے پر خوشی خوشی اپنے گھر جاتا جو پنجاب کے ایک چھوٹے گاؤں میں تھا۔

اجیت سنگھ بظاہر چوکنا نظر آ رہا تھا البتہ اندر ہی اندر سوچ میں ڈوبا ہوا

تھا۔کئی روز سے اسے گھر کی یادرہ رہ کرآ رہی تھی۔کافی عرصے سے اُسے چھٹی نہیں ملی تھی اسی لیے گھر کی یاد رہ رہ کر آرہی تھی۔ماں بابو جی اس کی دو چھوٹی چھوٹی بیٹیاں شبواور شنواُس کا شریف النفس اورنوجوان بھائی بلونت جسے وہ اور گھر کے سبھی افراد پیار سے بلو بلو کہتے اوراس کی خوب صورت اور سمجھ دار بیوی رانو سبھی اُسے رہ رہ کر یادآ رہے تھے۔بلونت یا بلوکھیتی باڑی کا خیال رکھتا تھا اور شادی کی عمر کا ہو چکا تھا۔رانوجس سے اجیت سنگھ بے حد پیار کرتا تھاوہ گھر اور پورے پریوار کا خیال رکھتی تھی اور ہمیشہ کسی نہ کسی کی خدمت کرتی نظرآتی۔رانو کا خیال آتے ہی اجیت سنگھ کے دل میں ایک لہر یادوں کی اٹھی۔اسے رانو کے ساتھ گذارے ہوئے لمحے اوراس کی خوب صورتی یادآ رہی تھی۔ وہ اپنے آپ من ہی من میں فخر محسوس کرتا کہ اُسے رانو جیسی بیوی ملی۔اجیت سنگھ کواپنی شادی کے دن اور وہ راتیں یادآئیں جواس نے رانو کے ساتھ گذاریں۔وہ سبھی پل اُس کی زندگی کے قیمتی پل تھے۔وہ چاہتا تھا کہ اُڑ کر اپنے گاؤں اپنے گھر پہنچ جائے اور جاتے ہی رانو کواپنی باہوں میں اٹھا کراپنے کمرے میں لے جائے اوراُس کے ساتھ وہی شرارت کرے جس شرارت سے دونوں کولطف آتا تھا۔اجیت سنگھ ان ہی خیالوں میں ڈوبا تھا کہ اچانک اجیت سنگھ کوسامنے دھان کے کھیت میں تھوڑی سرسراہٹ محسوس ہوئی۔وہ تھوڑا چوکنا ہوا۔لیکن جب اُس نے غور سے دیکھا تو ایک دوشیزہ پگڈنڈی سے گھاس کاٹ رہی تھی اجیت سنگھ نے چین کی سانس لی ہی تھی کہ وہ دھنگ رہ گیا کیونکہ لڑکی جھک کر پگڈنڈی سے گھاس کاٹ رہی تھی۔جس کی وجہ سے اس کے سینے کا ابھار صاف نظرآ رہا تھا۔اجیت سنگھ کی نظریں اس لڑکی کے سینے میں گڈ گئیں اُس نے فوراً نظریں ہٹالیں مگراُسے اپنے اندرایک شعلہ سا لپکتا ہوامحسوس ہوا جیسے اُس کی نسیں پھٹ جائیں گی۔وہ دانت

پیس کر رہ گیا۔اچانک اس کے من نے چاہا کہ وہ اس حرارت سے نجات پائے۔

''مگر یہ پاپ ہے وہ اندر ہی اندر بڑ بڑایا''۔

پتا نہیں کب گھر جانا نصیب ہو اور کب مجھے میری اس جنسی الجھن سے نجات ملے۔

وہ سوچ میں ڈوب گیا اور اس کی نظریں برابر اُس دوشیزہ کے سینے پر تھی جو سامنے فوجی کی موجودگی سے بے خبر برابر گھاس کاٹ رہی۔

اگر لڑکی نے شور مچایا اور بات بڑھ گئی''۔

اُس نے اپنے آپ سے سوال کیا۔

پھر کیا ایسا کئی بار ہوا ہے پھر ان لوگوں کی ابھی تک کس نے سنی ہے اُس نے خود ہی اپنے سوال کا جواب اپنے آپ کو دیا پھر پتا نہیں جیسے اجیت سنگھ کے دماغ نے کام کرنا بند کیا اور وہ آگے بڑھا۔لڑکی نے سر اٹھایا اور فوجی کا ارادہ بھانپ گئی اس سے پہلے وہ چیختی چلاتی۔اجیت سنگھ نے اس کا منہ بند کیا اور لڑکی کو دبوچ لیا اور اپنی تمام الجھن عارضی طور مٹادی۔

جب اُسے تھوڑا سا ہوش آیا تو وہ اپنے فوجی کیمپ کی طرف بھاگ نکلا اور لڑکی چیختی چلاتی ہوئی اپنے پھٹے کپڑوں میں گھر کی طرف دوڑی زار زار روتی رہی اور بددعائیں دیتی رہی۔

گاؤں والوں نے کافی شور مچایا اور احتجاج بھی کیا۔بات میڈیا تک پھیل گئی۔حکام اور فوجی افسران نے انصاف کرنے کا ڈھونگ رچایا اور کسی طرح لوگوں کو خاموش کرایا۔فوجی افسر نے اجیت سنگھ کو بلا کر کہا۔دیکھو تھوڑے دنوں کے لیے تمہیں سرحد پر ڈیوٹی دینا ہوگی اور وہیں سے تم کو گھر جانے کے لیے چھٹی بھی ملے گی۔واپسی

پر تمہیں یہاں پر پھر تعینات کیا جائے گا جب تک یہ مسئلہ بھی ٹھنڈا ہو جائے گا اور ہاں ہم نے تمہارا نام میڈیا میں نہیں آنے دیا۔ اسی لیے یہ خبر محض ایک فوجی کی خبر ہے۔ اس میں تمہارا کہیں نام نہیں اور ہاں پریشان ہونے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔

اجیت سنگھ من ہی من میں اپنے آپ کو کوس رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس نے بہت بڑا پاپ کیا ہے۔ اسی لیے اس کا من بھاری بھاری رہنے لگا جیسے ساری دنیا اُجڑ گئی ہو۔ بہر حال وہ تقریباً دو تین مہینے سرحد پر دوسری بٹالین کے ساتھ رہا وہیں سے اُسے گھر جانے کے لیے چھٹی ملی۔ پہلی دفعہ وہ گھر جانے میں خوشی محسوس نہیں کر رہا تھا اُس نے تھوڑی چیزیں خریدیں اور پنجاب اپنے گھر لوٹا۔

گھر کے آنگن کا دروازہ کھولتے ہی اسے رانو پر نظر پڑی جو تبیلے سے گوبر نکال رہی تھی اس نے جب اجیت سنگھ کو دیکھا پہلے تو بہت خوش ہوئی اور دوڑی چلی آئی پھر اچانک رُک گئی اس کا چہرہ اُتر گیا۔ اجیت سنگھ گھبرا گیا جیسے اُس کی چوری پکڑی گئی ہو۔

کیا ہوا؟ اجیت سنگھ نے پوچھا۔

جی کچھ نہیں۔ چلیئے اندر چلیئے آپ تھکے ہونگے رانو بولی۔

ادھر رانو کو بھی اپنے پتی کے چہرے سے ہوائیں اڑتی نظر آئیں۔

شام کو جب سب اکٹھے کھانا کھا رہے تھے تو بابو جی نے اجیت سنگھ سے کہا' دیکھ بیٹا۔ اب کی بار آئے ہو تو بلو کی کہیں شادی پکی کراو۔ بے چارہ دن بھر کھیتی باڑی کرتا رہتا ہے اور جب تم یہاں نہیں ہوتے ہمارا خیال بھی رکھتا ہے۔ لیکن اب اس کی عمر شادی کرنے کی ہو گئی ہے۔

بلو نے شرم کے مارے نظریں نیچے کیں۔

کھانا کھا کر اجیت سنگھ اپنے کمرے میں لیٹا ہوا تھا تب رانو سارے کام نپٹا کر تھکی ہاری کمرے میں آئی۔ اجیت سنگھ اپنی پریشانی پر قابو پانا چاہتا تھا اسی لیے بولا۔ کافی دیر لگا دی۔

جی بہت سارا کام تھا اسی لیے؟ رانو نے جواب دیا۔

میں دیکھ رہا ہوں تم خوش نظر نہیں آ رہی ہو۔ اجیت سنگھ نے پھر سوال کیا۔

نہیں نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ رانو نے جواب دیا۔ آپ بھی تو ویسے خوش نہیں لگ رہے ہیں۔

نہیں تھوڑی تھکاوٹ ہے بس اور کچھ نہیں۔ اجیت سنگھ نے پھر اپنے من کا بوجھ چھپا لیا اور آگے بڑھ کر رانو کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لیا ہی تھا کہ رانو زور سے رو پڑی۔

رانو کیا ہوا بتاتی کیوں نہیں۔

اجیت سنگھ نے پریشان ہو کر پوچھا۔

جی ہمارے گھر کو کسی کی نظر لگ گئی وہ زور زور سے روتی رہی۔

دیکھ پہیلیاں مت بجھاؤ۔ کھل کر کہو کیا ہوا۔ اجیت سنگھ نے کانپتے ہوئے پوچھا۔

میں جانتی ہوں کہ آپ مجھے معاف نہیں کریں گے۔ لیکن میں بتائے بغیر رہ بھی نہیں سکتی چاہے انجام کچھ بھی ہو میں آپ کو دھوکا نہیں دے سکتی۔ کیونکہ پچھلے جنم کے میرے اچھے کرم تھے جو مجھے آپ ملے۔ رانو روتے روتے بول رہی تھی۔

دیکھو رانو گھبراؤ مت کھل کر کہو کیا بات ہے۔

رانو کہنے لگی، لگ بھگ تین مہینے پہلے ایک رات کو جب میں گھر کا سارا کام

نپٹا کر شبو اور شنو کو سلانے جا رہی تھی تو دونوں نے ضد کی ہم ماں اور بابو جی کے پاس ہی سوئیں گے۔ میں انہیں ماں اور بابو جی کے پاس چھوڑ کر اپنے کمرے میں آئی اور بستر پر لیٹے لیٹے آپ کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ من ہی من آپ کی یاد بہت ستا رہی تھی۔ آپ کے بارے میں سوچتے سوچتے ہی میری آنکھ لگ گئی۔ میں نے خواب دیکھا کہ جیسے آپ چھٹی لے کر گھر آئے ہیں اور میرے ساتھ میرے پاس ہی ہیں اور وہی شرارت کر رہے ہیں جس شرارت کے لیے میں آپ کے آنے کا انتظار کرتی رہتی ہوں اور دن گنتی رہتی ہوں۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ آپ میرے بدن کو اسی طرح چھو رہے ہیں جس طرح آپ کی عادت ہے لیکن میں پہلے سے بھی بہت زیادہ لطف اٹھا رہی تھی اور مجھے جی بھر کے پیار مل رہا تھا پر.....

پر کیا اجیت سنگھ کی آنکھوں میں وحشت اُتر آئی۔ جلدی کہو پر

پر! جب مجھے ہوش آیا' رانو کہتے کہتے پھر رو پڑی اور بولی۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے دیکھا...... رانو پھر کہتے کہتے رُک گئی۔

تو تم نے کیا دیکھا.......

اجیت سنگھ نے پریشانی میں چیخ کر کہا۔

رانو ڈرتے ڈرتے بولی میں نے دیکھا کہ میرے اوپر بلو لیٹا تھا۔

اجیت سنگھ دھنگ رہ گیا اور اس کے کانوں میں سننے کی صلاحیت نہیں رہی اسے رانو کی آواز بہت دھیمی دھیمی سنائی دی۔

''جی میں پچھلے دو مہینوں سے پیٹ سے ہوں''۔

☆☆☆

میرا مِتر میرا جی

ہر بار میرا یہ دعویٰ غلط ثابت ہوتا ہے کہ میں اسے جانتا ہوں۔

سچ یہ ہے کہ میں کبھی بھی اسے جان نہ سکا اور شاید نہ کبھی جان سکوں گا۔

کیونکہ ہر بار وہ ایسی حرکتیں کرتا ہے جس کی وجہ سے اس کی شخصیت کے نئے رنگ نئے پہلو سامنے آتے ہیں اور اسے جاننا، پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ میرا مِتر میرا جی ایک اُلجھی ہوئی گتھی ہے۔ لیکن پھر بھی میرا یہ دعویٰ ہے کہ وہ میرا دوست ہے۔ جس کے ساتھ میری بے حد جذباتی وابستگی ہے۔

میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ مجھے وہی الجھی ہوئی گُتھی والا میرا مِتر میرا جی سامنے سے اپنی طرف آتے ہوئے دکھائی دیا اور وہ آتے ہی جھٹ سے بولا۔

کیوں اختر صاحب کیا سوچ رہے ہیں۔

میرا جی ہمیشہ کی طرح اپنے ہاتھوں میں لوہے کے بنے تین گولے لیے ان سے کھیل رہا تھا۔ لمبے لمبے بال جس کی لٹیں کاندھوں تک آتی ہوئیں، لمبی مونچھیں، انگلیوں کے بڑے ہوئے گندے ناخن، مہینوں سے پانی کو ترستا ہوا جسم، ایک سے زیادہ پتلون، پھٹی پرانی شیروانی اور گلے میں ایک سو ایک دانے والی موتی مالا پہنے دوسرے سبھی لوگوں سے بالکل مختلف میرے سامنے کھڑا تھا اور میں اس کے سوال کو

اَن سنا کر کے اسے دیکھے جا رہا تھا اور من ہی من خود سے سوال کر رہا تھا کیا واقعی یہ ملنگ قسم کا آدمی میرا دوست ہے۔ میں نے آخر اس میں ایسا کیا دیکھا جو میں نے اس کے ساتھ دوستی کی۔ شاید یہ دیکھ کر کہ یہ بہت ذہین ہے یا پھر اس کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ جہاں بھی کتاب دیکھی وہیں اُسے چاٹ جاتا ہے۔ یا پھر اس کی ابہام سے لبریز شاعری پڑھ کر یا پھر یہ جان کر کہ یہ ایک سچا عاشق ہے۔ کچھ تو وجہ ہوگی جو میں اسے اپنا دوست مانتا ہوں۔ میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ میرا جی نے ایک بار پھر زور دے کر کہا

اختر صاحب کیا سوچ رہے ہیں' خیریت تو ہے۔

ہاں! ہاں! بالکل۔

میں نے چونک کر جواب دیا۔

تھوڑے وقفے کے بعد میرا جی کے چہرے کو گھورتے ہوئے میں نے سوال کیا۔

اچھا یہ بتاؤ اس جوگ کا کہیں انت بھی ہے کہ نہیں۔

جوگ!

کون سا جوگ؟ کیسا جوگ؟ میرا جی انجان بنتے ہوئے بولے۔

وہی جوگ جو تم نے لیا ہے۔ دیکھو سچ بتاؤ آخر اس حسینہ میں ایسی کون سی بات تھی جو تمہاری یہ حالت ہوگئی اور تم محمد ثناءاللہ ڈار سے میرا جی بن گئے۔ میں نے سوال کیا۔

میرا جی نے ایک لمبی آہ بھری تین گولے اپنی جیب میں رکھتے ہوئے کہا وہ کافر حسینہ ''میرا سین''، تھی ہی کچھ ایسی۔ میرا جی نے محبوبہ کا نام لیتے ہی دوسری جیب

سے میرا سین کی ایک چھوٹی سی تصویر جو کسی کالج میگزین سے تراشی ہوئی نکالی اور ساتھ ہی ایک گول شیشہ میگنفائنگ گلاس نکالا اور اس کی مدد سے تصویر کو دیکھنے میں محو ہو گیا۔ ایسا کرنے سے وہ تصویر بڑی دکھتی تھی۔

اُف تیرا یہ پاگل پن..... واقعی یک طرفہ عشق سزا ہوتا ہے۔

میں نے میرا جی کی یہ حرکت دیکھ کر کہا۔

لگتا ہے اس بنگالی لڑکی نے تم پر کوئی جادو کیا تھا جواب تک تم پر چل رہا ہے۔ ویسے بھی بنگال کا جادو مشہور تو ہے ہی۔

میرا جی مسکرایا پر کوئی جواب نہ دیا۔ تھوڑے وقفے کے بعد میں نے میرا جی سے کہا اچھا رہنے دو چلو گھر چلتے ہیں۔ میں میرا جی کو ساتھ لیے اپنے گھر کی اور چل دیا۔ راستے میں چلتے چلتے میں نے میرا جی سے مخاطب ہو کر کہا۔

یہ جو روپ تم دھارن کیے ہوئے ہو اس کے متعلق اکثر لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوتی ہوگی کہ یہ سب ایک ڈھونگ ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں یہ سب ایک ڈھونگ نہیں بلکہ کچھ اور ہے۔ ہاں البتہ اتنا ضرور ہے جو شاعری تم کرتے ہو وہ اچھے اچھوں کے پلے نہیں پڑتی۔ شاید اس میں بھی تمہاری طبیعت کی طرح ایک بغاوت چھپی ہے۔ اپنی پرانی ادبی روایات سے بغاوت۔

اختر صاحب آپ سمجھتے ہیں کہ اس میں میرا کوئی قصور ہے، ہرگز نہیں۔ نئی شاعری ایک مسلسل تجربہ ہے اور میری شاعری نئی شاعری ہے۔

راستے میں چلتے چلتے اور باتیں کرتے کرتے میں کئی بار میرا جی کی اور مُڑ کے دیکھتا رہا۔ مجھ کو اس بات کا احساس ہوا کہ میرا جی کی بری عادتوں، نشے کی لت، بے ترتیب زندگی کی وجہ سے میرا جی کی صحت پر برا اثر ہو رہا ہے اور میں نے دیکھا وہ

پہلے سے بھی اور زیادہ کمزور ہو گیا ہے۔ میں چلتے چلتے رُک گیا میرے ساتھ میراجی بھی رُکا۔ میں نے کہا دیکھو کچھ دن پہلے ہی ہم تمہاری گرتی صحت کے بارے میں ڈاکٹر سے ملے تھے۔ اس نے جن چیزوں کے لیے منع کیا ہے اب تو ان چیزوں سے پرہیز کرو' یہ بری عادتیں چھوڑ دو' یہ سارا نشہ' یہ شراب' یہ آوارگی چھوڑ دو' اپنی گرتی ہوئی صحت دیکھو۔ اب تو خدا کے لیے اپنے آپ پر رحم کرو۔ پورا دن بھوکے رہتے ہو' خالی پیٹ شراب پیتے ہو اور اپنی موت کو دعوت دیتے ہو۔ اتنی کم عمری میں کافی آگے نکل چکے ہو۔

میراجی نے میری نصیحت غور سے سنی پر ایک لفظ بھی جواباً نہ کہا۔

میں نے باتوں کا رخ دوسری اور موڑ دیا۔

اچھا یہ بتاؤ میں نے سنا ہے پچھلے ایک مشاعرے میں تم نے سامعین کی طرف پیٹھ کر کے اپنا کلام سنایا' ایسا کیوں؟

میراجی مسکرایا اور کہا جانے بھی دیجئے اختر صاحب۔ اور یوں میں خاموش ہو گیا۔ پھر چند گلیوں سے گزر کر ہم گھر پہنچے۔

کئی دن گذرے میراجی نشے کے شکنجے میں اور پھنستا گیا اپنی صحت کی اور زیادہ سے زیادہ لا پرواہ ہو گیا۔ نتیجہ اس کی صحت اور گرتی چلی گئی۔ میں نے کافی سمجھا بجھا کر اور منت سماجت کر کے اسے ہسپتال میں داخل کرایا۔

مجھے اس بات کا اطمینان ہوا کہ اب میراجی کا پورا علاج ہو گا اور وہ ٹھیک ہو جائے گا۔ لیکن جب میں اس سے ملنے ہسپتال گیا وہاں ڈاکٹروں اور دوسرے طبی عملے نے یہ شکایت کی کہ میراجی علاج کے معاملے میں تعاون نہیں کرتے۔ میں نے دیکھا میراجی کی حالت پہلے سے بھی زیادہ خراب تھی۔ پر ایسی حالت میں بھی اس

کے سرہانے اس کی پسندیدہ کتاب "Defeat of Boudlear" پڑی ہوئی تھی۔
تم یہاں بھی اس کتاب کو ساتھ لے آئے۔ میں نے حیرت سے پوچھا۔
اختر صاحب بودلیر سے مجھے عقیدت ہے۔ میرا جی نے بڑے ہی جذبے سے کہا۔
میں نے دیکھا میرا جی مر رہا ہے۔ لیکن وہ پھر بھی ٹھیک ہونا نہیں چاہتا۔ پتا نہیں یہ شخص کس مٹی سے بنا ہے۔ کہ اسے کسی بھی طرح کی راحت اور مسرت راس نہیں آتی۔ میرے ذہن ودل میں میرا جی کی نظم ''میں ڈرتا ہوں مسرت سے'' یہ مصرعے گونج اٹھے۔

''میں ڈرتا ہوں مسرت سے
کہیں یہ میری ہستی کو
بھلا کر تلخیاں ساری
بنا دے دیوتاؤں سا
تو پھر میں خواب ہی بن کر گذاروں گا
زمانہ اپنی ہستی کا''

مجھے میرا جی کی ایسی حالت دیکھ کر بے حد دُکھ ہوا اور میری آنکھیں چھلک پڑیں۔ پُرنم آنکھوں سے اپنے دوست کو جی بھر کے دیکھتا رہا اور خود کے ساتھ دھیمے ہونٹوں بڑبڑایا۔
دوست تم نے ایسا کیوں کہا ہے۔
''میرا جی کہہ کر پچھتایا اور پھر کہنا بھول گیا''
وقت آئے گا جب دنیا پچھتائے گی کہ اس نے تمہاری قدر کیوں نہیں جانی۔

پھر چند روز بعد مجھے یہ منحوس خبر ملی کہ میرا جی چل بسے۔ چلا گیا' آخر چلا گیا۔موت کا عاشق اس کی آغوش میں چلا گیا۔

میرا مِتر میرا جی آخر چلا ہی گیا۔

میرے علاوہ تین اور کاندھوں نے میرا جی کو اس کی آخری آرام گاہ تک پہنچایا اور اس کے جنازے میں بھی میرے علاوہ صرف تین ہی لوگ تھے۔

لحد نے اسے اپنی گود میں لے کر احتیاط سے سنبھالا' جیسے مٹی کو بھی پتا تھا کہ نگری نگری پھرنے والا یہ مسافر صرف ساڑھے سنتیس سال کی عمر میں ہی کافی تھک چکا ہے۔

☆☆☆

شُونیہ

اگر آپ کو قصہ سننے میں دلچسپی ہے تو سنیے۔

میں سینئر سرجن ڈاکٹر یوگی۔

چند سال قبل میں نے ایک فیصلہ لیا' فیصلہ لینے کے بعد مجھے لگا شاید میں نے جلد بازی کی۔ جس کی وجہ سے مجھے یہ چند سال نہایت بے چینی اور اضطراب میں گذارنے پڑے۔

لیکن آج مجھے پورا یقین ہوگیا کہ میرا لیا ہوا فیصلہ درست تھا ایک دم درست۔

ہوا یوں کہ میں ایک دن اپنے ایک دوست کی پارٹی میں شریک ہوا۔ شام تک اپنے کام کے ساتھ مصروف رہنے کی وجہ سے میں کافی تھک چُکا تھا۔ میں نے سوچا پارٹی میں ایک دو ڈرنک لوں گا اور ٹھیک ہو جاؤں گا۔ میں ایک صوفے پہ بیٹھا اپنی تھکان مٹا رہا تھا کہ میرا وہ دوست جس نے مجھے انوایٹ کیا تھا میرے پاس آیا اور مجھ سے کہا۔

یار ڈاکٹر چلو تمہیں ایک دلچسپ آدمی سے ملاتا ہوں' وہ ہے تو اس شہر میں اجنبی لیکن دو ایک چند دوستوں کا مختصر سا حلقہ رکھتا ہے' زیادہ تر تنہائی پسند ہے اور اکثر کتابوں میں ڈوبا رہتا ہے۔ پیشے سے ایک پروفیسر تھا پر اب ریٹائر ہو چکا ہے اور باتیں اتنی دلچسپ کرتا ہے کہ آدمی کو اپنی علم و دانش پر شبہ ہونے لگتا ہے۔ چلو اٹھو بھی میں تمہیں اُس سے

ملاتا ہوں۔ بڑی مشکل سے میں نے اُسے پارٹی میں آنے کے لیے راضی کیا ہے۔ چونکہ میں بہت تھک چکا تھا اسی لیے کسی سے ملنے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔لیکن اپنے دوست کی خاطر اٹھ کھڑا ہوا۔

میرے دوست نے مجھے ایک ایسے شخص سے ملایا جو جسمانی طور پر کافی کمزور لگ رہا تھااور جس کے بال بالکل سفید ہو چکے تھے۔لمبا قد رکھنے والے اِس شخص کے چہرے پر ایک عجیب قسم کی اُداسی چھائی ہوئی تھی۔فکر میں ڈوبی ہوئی آنکھیں جیسے کسی چیز کی متلاشی ہوں۔

میرے دوست نے بڑے اعتماد کے ساتھ اونچی آواز میں پکارا۔

پروفیسر صاحب اِن سے ملیئے یہ ہیں میرے دوست اس شہر کے مشہور سرجن ڈاکٹر یوگی اور یارڈاکٹر یہ ہیں پروفیسر آریہ شکھر۔آپ دونوں باتیں کریں میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔

میں نے بڑے ادب سے ہیلو کہا۔

ہیلو۔ پروفیسر آریہ شکھر نے بڑی سرد مہری سے جواب دیا۔

میں نے پوچھا' پروفیسر صاحب آپ کا ہاتھ خالی کیوں ہے' آپ کا گلاس کہاں ہے۔

جی میں نہیں پیتا۔

پروفیسر نے پھر سرد مہری سے جواب دیا۔

لگتا ہے آپ کو میرے ملنے سے کوئی خاص خوشی نہیں ہوئی۔میں نے کہا۔

خوشی کس بات کی ۔جو بات متوقع ہو اُس کے ہونے پر بلا کیسی حیرانگی اور کیسی خوشی۔

متوقع.....! مطلب میں سمجھا نہیں۔

ڈاکٹر یوگی ہمارا ملنا پہلے ہی طے تھا۔آپ تو صرف بس وہاں سے اٹھ کر میرے پاس چل کر آئے ہیں بس۔

بس.....ہاہاہا.....اِس کا مطلب یہ کہ آپ کو پہلے سے ہی پتہ تھا کہ ہم یہاں پر ملیں گے، میری ہنسی رُک نہیں رہی تھی۔

ڈاکٹر آپ نے میری بات غور سے نہیں سنی۔ میں نے کہا ہمارا ملنا پہلے سے ہی طے تھا۔ دنیا کی ہر بات ہر واقعہ ہر لمحہ پہلے سے ہی طے شدہ ہے۔ ہر چیز پہلے سے ہی پلان کی ہوئی ہے۔ دیکھئے اگر آپ یہاں سے گھر جاتے وقت راستے میں کہیں حادثے کا شکار ہو جاتے ہیں تو وہ پہلے ہی طے ہے اور اگر آپ صحیح سلامت اپنے گھر پہنچ جاتے ہیں تو وہ بھی پہلے سے ہی طے ہے۔ کیونکہ جب جب جو جو ہونا ہے تب تب سو سو ہوتا ہے۔

پروفیسر صاحب کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔لیکن باتیں دلچسپ ضرور تھیں۔ میں نے اپنی جیب سے کارڈ نکالا اور پروفیسر صاحب کی اور بڑھاتے ہوئے ان سے درخواست کی۔

پروفیسر صاحب کبھی فرصت ملے تو میرے کلنِک پر ضرور تشریف لائیے گا۔

چند روز بعد میں حیران ہوا جب مجھے اپنے کلنِک پر ایک پرچی ملی جس پر لکھا تھا ''پروفیسر آریہ شِکھر''۔

ہاں ہاں آنے دو۔

میں نے بڑی گرم جوشی سے خوش آمدید کہا۔

پروفیسر صاحب اپنی بغل میں چند کتابیں دبائے ہوئے تھے۔

آپ کیا لیں گے، کچھ ٹھنڈا یا گرم۔

نہیں نہیں کچھ بھی نہیں۔

اصل میں میرے پاس کچھ پرانی نایاب کتابیں ایسی ہیں جن میں کچھ ایسی ترکیبوں کا ذکر ہے جن سے انسان کئی دنوں تک بھوکا، پیاسا رہ سکتا ہے۔یقین کرو گے۔میں نے پچھلے تین روز سے کچھ بھی نہیں کھایا پیا ہے۔

لیکن ایسے تو بڑی مشکل ہو جائے گی۔وقت ایک جیسا نہیں رہتا۔اوپر والا نہ کرے ایسا وقت بھی آ سکتا ہے کہ آپ کے جسم میں کئی کمزوریاں، کئی بیماریاں ایک ساتھ جنم لے سکتیں ہیں۔

وقت.....وقت......

کیسا وقت...... کون سا وقت......۔

ڈاکٹر ہم سب وقت کے بارے میں کچھ نہیں جانتے، کچھ بھی نہیں۔ پروفیسر آریہ شکھر نے کہا اور ساتھ ہی بات بڑھاتے ہوئے کہنے لگے۔

انسان نے وقت کو مائیکر وسیکنڈ، سیکنڈ، منٹ، لمحہ، گھنٹہ، پہر، بارہ گھنٹے، چوبیس گھنٹے، دن، رات، ہفتہ، مہینہ، سال، دہائی، صدی اور مختلف ادوار میں تقسیم کیا ہے۔جب کہ وقت کی تقسیم ناممکن ہے۔یہ ساری تقسیم ایک جھول ہے۔انسان نے یہ ساری تقسیم اپنی آسانی کے لیے کی ہے ورنہ وقت کو بانٹنا ناممکن ہے کیونکہ وقت گذرتا نہیں بلکہ ہم وقت کے دھاروں کے بیچ میں سے گذر جاتے ہیں۔وقت تو ایک مستقل ساکت اور ٹھہری ہوئی شئے ہے۔

میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ایک شخص جس کو میں اچھی طرح سے نہیں

جانتا وہ اپنے فلسفے کی نوک پر تمام دنیا کے ڈسپلن کو چیلنج کر رہا تھا اور سب سے بڑی حیرانگی کی بات جو تھی وہ یہ کہ یہ سب فلسفہ کہنے والے میں بڑے غضب کا اعتماد تھا۔ میں پروفیسر کی باتوں سے پریشان سا ہو گیا لیکن میں نے جلدی ہی اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے پروفیسر صاحب سے کہا۔

جی مجھے ایک پیشنٹ کو دیکھنے جانا ہے پھر کبھی بات کریں گے اور خود کلنِک سے باہر نکل آیا۔

چند روز بعد جب میں اپنے کلنِک پر پہنچا' رسپشنسٹ نے مجھ سے کہا۔

سر کوئی صاحب اندر آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔

میں اپنے چیمبر میں داخل ہوا تو دیکھا پروفیسر آریہ شکھر کرسی پر براجمان تھے۔

کیوں پروفیسر صاحب آج پھر وقت پر کوئی تقریر جھاڑنی ہے۔

نہیں نہیں بالکل نہیں۔ بلکہ مجھے تو اپنے آپ پر بے حد غصہ آ رہا ہے۔

کیوں۔

میں نے حیرانگی سے پوچھا۔

وہ اس لیے کہ میں اب تک' ہونی انہونی اور وقت کے جھمیلوں میں خواہ مخواہ پڑا ہوا تھا۔ جب کہ اصل اور دلچسپ موضوع میری نظروں سے اوجھل رہا۔

کون سا موضوع۔

ہندسوں کا۔

اور ہندسوں میں بھی سب سے زیادہ دلچسپ اور اٹریکٹیو ہندسہ شونیہ کا ہے۔

ارے پروفیسر صاحب شونیہ کیا ہوتا ہے۔ کچھ بھی تو نہیں' شونیہ مینز نہ تھِنگ۔

جسے ہم سب نہ تھِنگ سمجھتے ہیں وہ اصل میں بہت کچھ ہے۔ آپ بے شک

شونیہ کی بائیں طرف جو کچھ بھی لکھیں گے اس کی وقعت یقیناً کچھ نہیں ہوتی ہے۔لیکن اگر آپ کسی ہندسے کے دائیں طرف شونیہ جوڑتے جائیں گے تو لاکھوں کروڑوں کی گنتی وجود میں آئے گی۔

یہ تو ہم سب جانتے ہیں اس میں دلچسپی کی بات کہاں سے آئی۔ میں نے پوچھا۔

شونیہ ہی وہ ہے جہاں سے آغاز ہوا ہے‘ دنیا کا‘ انسان کا‘ کائنات کا۔

کیونکہ یہ ہم سب جانتے ہیں کچھ ہونے سے پہلے کچھ بھی نہیں تھا۔

میں پروفیسر صاحب کی باتوں سے بور ہونے لگا اور وہ یہ بات جلدی ہی بھانپ گئے۔اسی لیے خود ہی بول اٹھے۔

میں آپ کا وقت ضائع نہیں کروں گا۔اصل میں آپ کی مدد چاہیے تھی۔

مدد۔

کیسی مدد۔

میں جو آپ سے کہنے جارہا ہوں وہ کوئی مذاق نہیں۔ پروفیسر صاحب سنجیدگی سے کہنے لگے۔

کیونکہ میں جس طرح کی مدد چاہتا ہوں اس کے لیے آدمی کا بھروسے مند ہونا بے حد ضروری ہے۔

ہاں ہاں کہیے۔

میں شونیہ کو ایکسپرینس کرنا چاہتا ہوں اور میں شونیہ کے اس دلچسپ سفر پر نکل جانا چاہتا ہوں۔

شو...... شونیہ...... کا سفر۔

میں نے حیرانگی سے پوچھا۔

ہاں ہاں میں اصل میں اپنی ذات کو شونیہ پر لانا چاہتا ہوں۔یہی میری زندگی کا سب سے بڑا دلچسپ تجربہ ہوگا۔اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ میری یاداشت، جنسی خواہش، آنکھوں کی بصارت، کانوں کی سماعت اور بولنے کی طاقت چھین لو۔

اب تو میں ایسا عمل بھی سیکھ گیا ہوں، جس سے میں کئی دنوں تک بھوکا پیاسا رہ سکتا ہوں۔

ڈاکٹر میں شونیہ کو محسوس کرنا چاہتا ہوں اپنے وجود میں شونیہ کو سمو لینا چاہتا ہوں اور میں اسی شونیہ میں اپنی ذات کو فنا کرنا چاہتا ہوں۔جب ایسا ہوگا تب میرے اندر صرف میں ہوں گا۔

مجھے پتہ ہے اس کے لیے آپ کو میرے کچھ اوپریشن کرنے پڑیں گے۔ مجھے چند دوائیں بھی لینی پڑیں گی۔میں سب کرنے کے لیے تیار ہوں۔فقط آپ کے مدد کی ضرورت ہے۔

مجھے پروفیسر کی باتوں سے عجیب سی گھبراہٹ ہونے لگی۔ میں بے حد پریشان ہو گیا۔میرے لیے کچھ بھی سوچنا ناممکن تھا میں انسانی علم کا ڈارک سائیڈ دیکھ رہا تھا۔کیا واقعی انسان علم میں اس جنونی حد تک ڈوب سکتا ہے۔

میں نے جواب میں کہا۔

پروفیسر صاحب یہ ایک غیر انسانی فعل ہے۔نہایت برا کام، میرا کام زندگی دینا ہے لینا نہیں اور آپ یہ جو کہہ رہے ہیں یہ سب خودکشی کے برابر ہے۔

لیکن ڈاکٹر میں نے بڑی امید کے ساتھ آپ کا انتخاب کیا ہے۔

میں نے دیکھا پروفیسر آریہ کی آنکھوں میں عجیب سی التجا تھی۔

میں نے کہا۔

اچھا سوچتا ہوں۔ اور یوں پروفیسر کو ٹال دیا۔لیکن پروفیسر آریہ بھی کہاں ماننے والے تھے۔ روز میرے کلِنک کا چکر لگاتے رہتے تھے۔ یہاں تک کہ میں تنگ آ گیا۔ ہر بار وہی التجا کرتے تھے۔ پھر آخر کار میں نے پروفیسر آریہ سے کہا۔

آپ کل آجایئے۔ میں نے کچھ ضروری انتظامات کر رکھے ہیں۔کل آپ کا کام ہو جائے گا۔

اگلے روز میرے آنے سے پہلے ہی پروفیسر آریہ میری کلِنک میں موجود تھے۔بس پھر کیا تھا۔ میں نے وہ فیصلہ لیا جس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں، میں نے پروفیسر آریہ شِکھر کو دوسرے ڈاکٹر اور دو تین آدمیوں کے حوالے کیا۔کسی غلط کام کے لیے نہیں بلکہ پروفیسر آریہ شِکھر کو مینٹل ہاسپٹل میں بھرتی کرنے کے لیے۔

پھر پتہ نہیں کیوں چند برسوں تک مجھے یہ بات چبھتی رہی کہ میں نے شاید جلد بازی میں فیصلہ لیا لیکن چند برسوں کے بعد آج جب میں نے مینٹل ہاسپٹل فون کر کے ایک ڈاکٹر سے پروفیسر آریہ کے بارے میں دریافت کیا تو مجھے پتہ چلا کہ پروفیسر آریہ شِکھر ابھی بھی شونیہ کے چکرویو میں پھنسے ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر نے بتایا کہ پروفیسر اکثر اپنا بازو اٹھا کر ایک انگلی سے ہوا میں شونیہ کے دائرے بناتا رہتا ہے اور اپنے ساتھ 'شونیہ' 'شونیہ' بڑبڑاتا رہتا ہے۔

☆☆☆

منٹو کہانی

سمجھداری کی باتیں ناسمجھوں کے لیے رہنے دو
انہیں ان باتوں کی ضرورت ہے مجھے نہیں
نہیں نہیں پھر بھی کچھ تو کہو تم تو مر چکے ہو نا پھر اس طرح زندہ یہاں.....
لیکھک نے زور دیتے ہوئے پوچھا۔
وہ مسکرایا اور بولا۔
تخلیق کار تب تک نہیں مرتا جب تک اس کی تخلیق زندہ ہو۔

اُس کے لہجے میں بڑا اعتماد تھا اور اس نے اطمینان سے لیکھک کی بات کا جواب دیا۔ وہی جو کچھ دیر قبل لیکھک کے کمرے میں اچانک نمودار ہوا اور اپنے آپ کو منٹو بتا رہا تھا۔ دُبلا پتلا درمیانہ قد، رنگ گندمی، کالے سیاہ بے ترتیب بال موٹی موٹی آنکھوں پر گول چشمہ، سفید کُرتا پاجامہ زیب تن کیے لیکھک کے کمرے میں اکثر خالی رہنے والی دوسری کُرسی پر براجمان تھا۔ لیکھک اسی پریشانی میں تھا کہ یہ سب کیسے ممکن ہے وہ گھبراتے ہوئے منٹو سے پوچھ بیٹھا۔

کیا تم واقعی وہی منٹو ہو جسے لوگ شرابی، فراڈ، فحش نگار، اڈیل، ضدی، رجعت پسند کہتے تھے۔

وہ لیکھک کی گھبراہٹ دیکھ کر مسکرایا اور بولا

گھبرائے بغیر پوچھو مجھے ان القاب کی عادت بہت پہلے سے ہے۔ ہاں بالکل میں وہی بدنام منٹو ہوں جسے اپنے وقت میں لوگوں نے ایسے ہی ناموں سے نوازا۔ اچھا یہ بتاؤ' منٹو ساتھ ہی پوچھ بیٹھا' تم یا تمہارے جیسے اور کئی لوگ میرے جیسے کیوں بننا چاہتے ہو۔

کیوں...... کیونکہ ہم تم کو ایک عظیم افسانہ نگار مانتے ہیں۔

وہ پھر مسکرایا اور کہا

میری خوبی بتارہے ہو یا اپنی خامی۔ تم بھی تو لیکھک ہو۔

جو تم سمجھو مگر جس گہری نظر سے تم نے زندگی کا مشاہدہ کیا وہ بھلا کا ہے۔ میں اور میرے جیسے اور کئی اگر تمہاری جیسی نظر پانا چاہتے ہیں تو اس میں برا کیا ہے۔

ایسی غلطی کبھی نہ کرنا دوسرے کی عینک اپنی آنکھوں پر لگا کر دنیا کو دیکھنے اور پرکھنے کی غلطی کبھی نہ کرنا ورنہ ہر چیز غلط نظر آئے گی۔ میں نے جو محسوس کیا وہی لکھا۔ تم لوگوں کی طرح نہیں' تم لوگ مطالعہ کی کھاد سے تخلیق کے شجر کو تناور کرتے ہو' جب کہ میں نے زندگی کی نمی سے اپنے فن کو سینچا ہے۔

میں نے اپنی ۴۲ سال کی عمر میں بہت کچھ دیکھا اور بھوگا۔ دو متضاد رنگوں میں میرا بچپن بیتا۔ ماں ہر ماں کی طرح رحم دل اور پیاری تو تھی مگر باپ نہایت سخت مزاج تھا' جوں جوں میری پرورش ہوئی مجھے اپنے آپ کی پہچان ہونے لگی۔ پڑھائی کے دنوں سے ہی مجھے اس بات کا احساس ہونے لگا کہ میں شکست اور مخالفت کسی بھی حال میں برداشت نہ کرسکوں گا اور وہی ہوا بھی۔ مجھے اپنے اس مزاج کی وجہ سے نوکریوں سے بھی ہاتھ دھونا پڑا۔ مطالعہ میرا شوق رہا۔ کتاب بھوت بن کر میرے ذہن پر سوار رہی ایک دفعہ کتاب چوری بھی کی مگر پکڑا گیا' کہانیاں لکھیں تو بڑے

دوٹوک الفاظ میں سچی کہانیاں لکھیں، طوائفوں کے کوٹھے سے لے کر ملک کے بٹوارے کے بعد مہاجرین کے کیمپوں تک ویشیا کے چکلے سے لے کر مزدور کے گھر تک، جس قسم کا بھی استحصال نظر آیا اس پر لکھا اور بے باکی سے لکھا۔

ہاں ہاں لیکھک نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

واقعی تمہاری کہانیاں کافی بولڈ ہیں۔ جو سماج شرافت کا لباس پہن کر اداکاری کے جوہر دکھاتا ہے تم نے اس کو تنہائی میں نہیں بلکہ بیچ چوراہے پر ننگا کیا۔

منٹو کے چہرے پر سنجیدگی کے آثار اور بھی نمایاں ہونے لگے، جیب سے سگریٹ نکال کر اسے سلگایا اور لمبے لمبے کش لے کر کچھ وقفے کے بعد سگریٹ اپنے ہونٹوں میں دبا کر کہنے لگا۔

بھلا اس سماج کو کیسے ننگا کیا جا سکتا ہے، جو پہلے سے ہی عریاں ہو۔ چولی اس کی اتاری جاتی ہے جس نے پہنی ہو۔

پھر بھی تمہارے لکھے افسانے جیسے ''کھول دو''، ''ٹھنڈا گوشت''، ''ہتک''، '' کالی شلوار''، ''شریفن''، '' سہائے''، '' موذیل''، '' یا ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' وغیرہ ہمیشہ قارئین کو یاد رہیں گے۔

ہاں ہاں بالکل! منٹو کہنے لگا!

میں نے ملک تقسیم ہوتے دیکھا، رشتوں کا بٹوارہ دیکھا، فسادات کا عینی شاہد بنا، انسان کو حیوان بنتے دیکھا ایسے حالات میں، میں نے وہی لکھا جو شاید مجھے لکھنا چاہیے تھا۔ میرے لکھے افسانوں کی طرح ان میں موجود کردار بھی امر ہو گئے۔ خود تو ۴۲ سال کی عمر پائی لیکن سوگندھی (ہتک) کو صدیوں کی عمر عطا کی۔

لیکھک نے پھر بات کاٹی اور کہا یقین نہیں آتا تم جیسے سنجیدہ تخلیق کار کو کبھی

پاگل خانے بھی جانا پڑا ہوگا۔

ہاں ایسا ہوا ہے منٹو نے جواب دیا۔

ایسی قربانیاں دینی پڑتیں ہیں۔میری برسوں کی آوارہ گردی' کثرت شراب نوشی اور مزاج میں شامل چڑ چڑے پن نے مجھے بہت برے دن بھی دکھائے ہیں۔ خیر میری تحریریں میرے وجود کے ساتھ نہ مٹ سکیں۔ میری تحریریں کسی بے سایہ دیوار پر لکھی ہوئی تحریریں نہ تھیں جو وقت کی برساتوں سے ڈھل جاتیں۔

لیکھک نے اقرار میں سر ہلایا اور کہا

لوگ بھی مانتے ہیں کہ تم نے ایک ماہر سرجن کی طرح سماج کا پوسٹ مارٹم کیا۔

دیکھو! لوگوں کی بات نہ کرو' منٹو خفا ہو گیا لوگوں نے مجھ پر مقدمے کیئے جرمانے عائد کیے اور میرا نام سن کر گالیاں بکتے رہے۔ لوگوں کی بات نہ کرو۔ منٹو آگ بگولہ ہوا' اس نے سگریٹ کے دو تین کش جلدی جلدی لیے اور سگریٹ ایش ٹرے میں غصے سے بجھا دی۔

اس میں ناراض ہونے کی ضرورت نہیں' لیکھک نے مناتے ہوئے کہا' اپنے اپنے وقت میں ہر جینیس کے ساتھ یہی ہوا ہے۔

منٹو خاموش رہا تھوڑے وقفے کے بعد جب غصہ ٹھنڈا ہوا تو بولا' جب لوگوں کو میری کہانیاں بری لگیں تو مجھ سے خفا رہے پھر جب ان کہانیوں کی گہرائی میں جا کر انہیں مجھے سمجھنے کی سُدھ بُدھ آئی تب تک میں منوں مٹی تلے دب کر دفن ہو چکا تھا' پتا نہیں لوگوں کو میری کس عادت پر اعتراض تھا۔ ورنہ میں نے اپنی طرف سے ہمیشہ یہی کوشش کی کہ کبھی سچ کا ساتھ نہ چھوٹے حالانکہ ایک وقت ایسا بھی آیا جب مجھے روز ہاں ہاں ہر روز ایک نئی کہانی لکھنی پڑتی تھی۔ مگر یقین جانو ایسی حالت میں بھی

میں نے سچ کا ساتھ نہ چھوڑا۔

منٹو کی باتوں سے لیکھک کی آنکھوں میں اِک عجیب سی چمک عود آئی اور اس نے جذباتی ہوکر منٹو سے پوچھا۔

کیا ہم میں سے کوئی بھی تمہارے جیسا نہیں بن سکتا۔

منٹو مسکرایا اور بولا تم لوگ تخلیقی اڑان کے گھوڑے کو لگام ڈال کر قابو میں کرنا چاہتے ہو مگر اس طرح وہ صرف ادھم مچاتا ہے۔

میں سمجھا نہیں لیکھک نے حرانگی سے کہا

دیکھو میں نے کچھ دنوں کے لیے ڈرائیونگ کا کام بھی کیا ہے' اس لیے ایک عام فہم مثال دے کر سمجھاتا ہوں۔

جب تم ڈرائیو کرتے ہو تو اکثر دور سے دِکھنے والے سپیڈ بریکر کو دیکھ کر اپنی گاڑی کی رفتار کم کر دیتے ہو تا کہ تمہیں یا تمہاری گاڑی کو کوئی نقصان نہ پہنچے' پر میں ایسے مقامات پر بے خوف وخطر اپنی تیز رفتار سے گذر ا ہوں۔

اس بار لیکھک نے مسکراتے ہوئے ایک بار پھر بات کاٹی اور کہا

نتیجہ تمہیں تو خود نقصان ہوا ہی پر تمہاری گاڑی بھی سلامت نہ رہی۔ اس بات پر دونوں نے زور سے قہقہہ لگایا' جس کی صدا کمرے سے باہر سنائی دی۔ تبھی دروازے پر دستک ہوئی اور آواز آئی۔

اجی سنیے اندر کون ہے؟

اتنی رات گئے کس سے باتیں کر رہے ہیں۔

لیکھک نے منٹو کو انگلی سے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور خود دروازہ کھولنے گیا۔ دروازے پر اس کی بیوی حیرانگی کے عالم میں ابھی ابھی نیند سے جگی ہوئی کھڑی

تھی ۔جی اندر کون ہے جس کے ساتھ آپ اس طرح زور زور سے ہنس رہے ہیں۔

ارے اللہ کی بندی کون ہوسکتا ہے، کوئی بھی تو نہیں، لگتا ہے تم نے کوئی خواب دیکھا ہے۔ جاؤ جا کر سو جاؤ۔لیکھک نے بیوی کو دروازے سے ہی ٹال دیا اور کمرے کا دروازہ بند کر کے واپس پلٹا تو دیکھا کرسی خالی ہے۔ ادھر ادھر نظریں دوڑائیں پر منٹو کہیں نہیں تھا۔

کمرے میں سگریٹ کا دھواں تیر رہا تھا، لیکھک نے دیکھا کاغذ پر منٹو کہانی اُتر آئی تھی۔

☆☆☆

اپنی دُھن میں رہتا ہوں

صاحبۆ ستَھ چھَم مےٚ چأنی وَتھ مےٚ اَصلِچ ہاوتم

(میرے مالک مجھے تیرا ہی سہارا ہے مجھے صحیح راستہ دکھا)

سکول کے صحن میں وہ بھی نرمل اور شیتل من سے دوسرے بچوں کی آواز سے آواز ملا کر پرئیر پڑھ رہا تھا۔ بیچ بیچ میں اپنے داہنے پیر سے بائیں ٹانگ کو کھجاتا۔ پھر گھنٹہ بجا اور وہ بھی اپنے کلاس روم کی طرف لپکا۔ تھوڑی شرارت کرنے لگا کسی کی پنسل چھین لی تو کسی کی چٹکی کاٹی۔ جب استاد کلاس روم میں داخل ہوا تو وہ بھی اور بچوں کی طرح ایک دم شریف بچہ بن گیا اور کتاب کھول کر سبق پڑھنے لگا۔

میرا نام ولی ہے۔

میرا نام اکبر ہے۔

کتاب میں چھپی ولی اور اکبر کی ہنسا دینے والی تصویروں کو دیکھ کر وہ خوب ہنسا اور پھر تختی سجانے لگا۔ خوب چمک دار تختی تیار کر کے بہت احتیاط کے ساتھ رُک رُک کر اُس پر لکھنے لگا۔

اللہ سب کا مالک ہے۔

علم ایک نور ہے۔

استاد کے چلے جانے کے بعد پھر مستی کرنے لگا۔ دھما چوکڑی مچانے لگا۔

کاغذ پھاڑنے لگا سیاہی کی چھینٹوں سے اپنے ہاتھ اور یونیفارم کو رنگ دیا پھر دوستوں کے ساتھ کھیلتا' دوڑتا ہوا روٹی کھانے کے لیے گھر لوٹا۔ ماں ہمیشہ کی طرح روٹیاں بیل رہی تھی۔

اس کے بالوں کی لٹ بار بار اس کی آنکھوں پہ آتی اور وہ آٹے سے لت پت ہاتھوں سے اپنی یہ لٹ سنبھالتی۔ پھر اچانک اس کی نظر سیاہی کے دھبوں سے خراب ہوئی یونیفارم پر پڑی اور وہ آگ بگولا ہو کر بیلن لے کر اسے مارنے دوڑی۔ جب وہ ہاتھ نہ لگا تو تھک ہار کر بیٹھ گئی۔ پھر وہ خود آکر چپکے سے ماں کی گود میں بیٹھ گیا اور ماں اس کی گندی یونیفارم کو بھول گئی اور اسے چومنے لگی اس کی بلائیں لینے لگی۔ پھر روٹی کے نوالے اسے اپنے ہاتھوں سے کھلانے لگی۔

پیں...... پیں...... پیں......

گاڑی کے ہارن سے وہ چونک پڑا۔

آج پھر کام پر جانے میں دیر ہوگئی۔ مجھے چلنا چاہیے۔

گورنمنٹ پرائمری سکول کے سامنے سے گذرتے ہوئے جب بھی بچے پرئیر پڑھتے ہوئے اس سے سنائی دیتے تو اس کے قدم خود بہ خود رُک جاتے اور وہ سکول کی آدھی گری ہوئی بوسیدہ دیوار سے سکول کے صحن کی اور دیکھتا اور پرئیر پڑھتے ہوئے بچوں کو دیکھ کر کھو جاتا۔

مجھے...... مجھے چلنا چاہیے۔

تھوڑی دور چل کر خانقاہ کے سامنے والی گلی پر نظر پڑی اور پھر سے سوچنے لگا۔

ہاں اِسی گلی کے نکڑ پر اکثر زردہ اور توشے و بتاشے بانٹے جاتے اور سب بچے ایک دوسرے پر سبقت پانے کی غرض سے ایک دوسرے کو دھکا دیتے ہوئے یہ

زردہ اورتوشے بتاشے حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔اکثراس گلی میں یہ چیزیں وہی عورت بانٹتی جسے سب بچے مائی کہتے اور وہ مائی زردے سے بھرا گول چوڑا برتن ہاتھ میں لیے گھنٹوں کھڑی رہتی۔

آج بھی مائی برتن ہاتھ میں لیے کھڑی ہے۔ضرور اس میں کچھ نہ کچھ بانٹنے کے لیے ہوگا۔

دے دو..... دے دو مائی..... دے دو مائی..... مجھے بھی..... دیکھو میں آپ کے سامنے ہاتھ پھیلائے کھڑا ہوں۔

منشا بھئی۔

منشا بھئی..... منشا بھئی یہاں کیا کر رہے ہو۔اوراس طرح.....

وہ چونک پڑا اور دیکھا اس کے سامنے مائی نہیں بلکہ بجلی کا کھمبا تھا۔

وہ..... وہ..... کیا ہے کہ.....

وہ شرمندہ ہوا اور جلدی سے اپنے پھیلائے ہوئے ہاتھ جنہیں اس نے بالکل ایسے اٹھایا تھا جیسے کوئی دعا مانگ رہا ہو پیچھے کیے اور گھبرا کر کہنے لگا۔

کچھ نہیں..... بس ایسے ہی..... اچھا میں چلتا ہوں۔

پھر وہ کام پر چل دیا۔راستے میں چلتے چلتے گردوغبار کا ایک جھونکا اُس سے ٹکرایا۔

اُف،اُف،اُف ایسے موسم میں اتنا گردوغبار' کہاں گئی وہ راہیں جو مہینوں برف سے ڈھکی رہتی تھیں۔

برف یہاں تک نہیں نہیں' یہاں تک پڑا کرتی تھی۔منشا اپنے ہاتھوں سے ٹانگوں پر انگلی سے ایسے نشان بنا رہا تھا جیسے کسی کو دکھا رہا ہو کہ کتنی برف پڑتی تھی۔پھر

اُس برف میں چلنا بھی دوبھر ہو جاتا تھا۔ منشا اپنی ٹانگیں اونچی اٹھا اٹھا کر کھینچتا ہوا چلنے لگا اور آخر کار دفتر پہنچ ہی گیا۔ ارے یار منشا کہاں رہ جاتے ہو، صبح سے صاحب تین بار تمہارے بارے میں پوچھ چکے ہیں۔

آؤ آؤ منشا جی...... بڑی جلدی آ گئے۔

وہ کیا ہے سر..... کہ سر..... چاروں اور برف.....وہ سبھی راہیں برف سے ڈھکی ہوئیں.....

منشا۔

صاحب چلایا۔

کیسی بے تکی باتیں کر رہے ہو۔ نظریں اٹھا کر دیکھو۔ چاروں اور دھوپ پھیلی ہوئی ہے۔ برف کا نام ونشان نہیں۔

منشا شرمندہ ہو کر کمرے سے باہر نکل آیا اور من ہی من میں سوچنے لگا ہر چیز میں برکت ختم ہو گئی ہے۔ یہ برف بھی نا........

پتا نہیں برف کو پگھل کر پانی ہونے کے لیے اتنی جلدی کیوں ہوتی ہے۔

وہ کام میں جُٹ گیا اور قریب پانچ بجے آفس سے نکل کر راستے میں چلتے چلتے بار بار اوپر آکاش کی طرف نظریں اٹھاتا جیسے آسمان پر کچھ ڈھونڈ رہا ہو۔

یہ سارا آکاش نیلی، پیلی اور ہری پتنگوں سے سجا رہتا تھا اور اب کوئی پتنگ بھی نظر نہیں آتی۔ شاید بچوں کے یونٹ ون کے ایگزامز چل رہے ہوں گے اور جن کے امتحانات نہیں ہے وہ گھروں میں ٹیلی ویژن کے سامنے نبی بنی، ڈورے مان، ٹام اینڈ جیری اوگی اینڈ کاکروچز اور چھوٹا بھیم دیکھ رہے ہوں گے۔ انہیں پتہ بھی نہیں چل پائے گا کہ کب ان کا قیمتی بچپن بیت گیا۔ کوئی مجھ سے پوچھے کہ زندگی کیا ہے تو میں کہہ دوں ''بچپن''۔

باقی تمام عمر ایک ڈراما ہے ایسا ڈراما جو نہ چاہتے ہوئے بھی سبھی کھیلتے ہیں۔منشا کی نظر سڑک پر چلتی ایک آٹھ نو سال کی بچی پر پڑی جو چند کتابیں ہاتھ میں اٹھائے ٹیوشن پڑھنے جا رہی تھی یا پڑھ کر واپس آ رہی تھی۔منشا سوچنے لگا ہمارے بچپن میں اس عمر کی لڑکی پڑھنے کے ساتھ ساتھ ست گرہ (سٹاپو) بنا کر کھیلا کرتی تھی۔

ست گرہ (سٹاپو)

زندگی کا فلسفہ سکھانے والا کھیل۔ایک ایک کر کے سات خانے فتح کرتے جاؤ اور اپنی کامیابی یقینی بناؤ۔ یہ کھیل زندگی میں رفتہ رفتہ کامیابی کی منزلیں طے کرنا بھی سکھاتا تھا اور اس عمر میں ہم لڑکے کسی پرانی سائیکل کے پہیے سے ٹیوب نکال کر کسی چھوٹی چھڑی سے اسے دوڑاتے اور اس کے ساتھ ساتھ خود بھی دوڑتے رہتے، دوڑتے پہیے میں توازن پیدا کرنا کوئی آسان بات نہیں تھی۔منشا نے اپنے دفتر کے کاغذوں کا ایک رول بنایا اور ہوا میں ایسے ہلانے لگا جیسے وہ بِنا ٹیوب والا پہیہ دوڑا رہا ہو۔پھر جب وہ ہانپنے لگا تو اسے تھکاوٹ محسوس ہوئی اور اس نے اپنی رفتار کم کی۔ وہ اب جہلم پر بنے پُل پر سے گذر رہا تھا تو اس کی نظریں گھاٹ پر جم گئیں۔ جہاں وہ بچپن میں اپنے دوستوں کے ساتھ دن بھر نہاتا اور تیرا کی کرتا رہتا۔ پھر جب اس کی اور اس کے دوستوں کی شکایتیں لگائی جاتیں تو انہیں سکول میں چھڑی سے پیٹا جاتا اور انہیں سزائیں دی جاتیں اور ساتھ ہی ان کی پیٹھ پر ایک مہر لگا دی جاتی جس کی سیاہی زیادہ پانی کے استعمال سے ختم ہو جایا کرتی تاکہ کوئی دوبارہ دن بھر تیراکی نہ کر سکے۔ اب یہ گھاٹ میرے من کی طرح بالکل سونا ہے۔اب اس گھاٹ پر کوئی میلہ نہیں لگتا اور نہ ہی شادمانیوں کی کوئی ناؤ اس گھاٹ پر آ کر ٹھہرتی ہے۔

میں ماضی کا باشندہ ہوں پتہ نہیں میں حال میں کیوں جی رہا ہوں۔

انہی سوچوں میں غرق منشا گھر پہنچا۔ منہ ہاتھ دھویا' کپڑے بدلے اور اپنے کمرے میں لیٹ گیا۔ بچے روز کی طرح ٹیلی ویژن پر کارٹون دیکھ رہے تھے۔ منشا کی بیوی آئی اور چائے رکھ کر چلی گئی۔

ہمارے پرانے گھر میں کتنی رونق لگی رہتی تھی سب ایک ساتھ رہتے تھے۔ ابو' چاچو' پھوپھی سب۔ شادی بیاہ کے موقعے پر اس رونق میں اور بھی اضافہ ہوتا تھا' اسی کے ساتھ ہی منشا کی آنکھ لگ گئی چچازاد بہن کی شادی ہے کتنی چہل پہل اور رونق ہے۔ چاروں طرف خوشیاں برس رہی ہیں۔ دلہن کو سجایا جا رہا ہے میں ان کے پاس جا کر بیٹھتا ہوں۔ دلہن سہیلیوں کے جھرمٹ میں بیٹھی پری لگ رہی ہے۔ جی کرتا ہے بس اُسے دیکھتا ہی رہوں۔

کیوں رے کیا دیکھ رہا ہے۔

مجھے تم سے شادی کرنی ہے۔

دُلہن اور اُس کی ساری سہیلیاں ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئیں۔ سب کو ہنستا دیکھ کر شرما کر بھاگ نکلا۔

ارے بیٹا کدھر جا رہے ہو۔ یہ لو اٹھنّی جا کچھ کھالے' چاچو کے بعد پھوپھی' ابو' امی' ماموں جو بھی ملا وہ کوئی نہ کوئی سکہ دیتا گیا اور پیار کرتا گیا۔ اتنے سارے پیسے! آج تو میں بڑے مزے کروں گا۔ پہلے ملائی والی کلفی لینی ہے' ایک غلیل خریدنی ہے' عزیز حلوائی کے پاس مٹھائی اور جُمن چچا کے پاس سے نیلے رنگ کی ایک بڑی پتنگ بھی لاؤں گا۔ واہ واہ کتنا مزہ آئے گا۔ میرے سارے دوست مجھ پر رشک کریں گے۔ مائی پھر زردہ بانٹ رہی ہے۔ چلو لے لیتا ہوں۔ ارے واہ تو شے اور بتاشے بھی بٹ رہے ہیں۔ یہ کھا کے ہی آگے چلتا ہوں۔ ابھی مجھے بہت ساری چیزیں

خریدنی اور کھانی ہیں۔ زردہ اور توشے بتاشے کھانے میں بڑا مزہ آیا۔ ارے دیر ہونے لگی ہے مجھے جلدی کرنی چاہیے۔ ایسا کرتا ہوں دوڑتا ہوں۔

پھر دوڑتے دوڑتے پتہ نہیں کیسے ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔

توبہ' توبہ' توبہ

چائے یہاں رکھی پڑی ٹھنڈی ہوگئی اور آپ پتہ نہیں کہاں کھو گئے۔ بیوی کی باتوں نے منشا کو جگا دیا۔ منشا نے چاروں اور نظریں دوڑائیں' وہ اپنے پرانے گھر میں نہیں بلکہ نئے گھر میں تھا اور کہیں کوئی رونق یا چہل پہل نہیں تھی۔

اٹھئے کھانا لگا دیا ہے۔ کھانا کھا کے اچھے سے سو جایئے۔ کافی تھکے ہوئے لگ رہے ہیں۔ بیوی نے منشا سے کہا۔

منشا جوں ہی اٹھا تو اس کی جیب سے چھن کی آواز آئی اور اُسے اپنی جیب بھاری سی محسوس ہوئی۔ منشا نے کانپتے ہاتھوں سے وہ بھاری چیز نکالی۔

اُس کا سارا بدن کانپنے لگا۔ ماتھے پر پسینے کی بوندیں چمکنے لگیں۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا پر گھبراہٹ کی حالت میں اُس کے حلق سے آواز نکل نہیں پا رہی تھی۔ اس نے اپنے جیب سے وہی سکے نکالے جو اُسے ابھی ابھی خواب میں ملے تھے۔ اُس نے غور سے دیکھا اُس کے ہاتھ زردے کے تیل سے لت پت تھے اور ہونٹوں پر توشوں اور بتاشوں کی مٹھاس چپک رہی تھی۔

☆☆☆

آوارگی

اُسے غم کی دیمک چاٹ رہی تھی۔

غم بھی ایک نہیں کئی تھے۔ ماں باپ کی توقعات پر پورا نہ اُترنے کا غم، ناکام محبت کا غم، اپنی مجبوریوں اور محرومیوں کا غم یا پھر آوارگی کا غم، آوارگی جو اُس کا مقدر بن گئی تھی۔ پر مجاز ہمیشہ ایسے نہ تھے۔

سلطان صاحب کہتے کہتے رُک گئے۔ سلطان صاحب، سلطان بک ڈیپو کے مالک، اُن کی کتابوں کی دکان ٹھیک مین بازار کے آخر پر بالکل جامع مسجد کے سامنے تھی۔ دُکان چوڑی کم اور لمبی زیادہ تھی، جہاں ادبی اور دیگر بے شمار کتابیں موجود تھیں۔ کتابیں چند ہی نئی تھیں، زیادہ تر کتابیں پھٹی پرانی اور بوسیدہ تھیں۔ اس دُکان کی طرف شاید ہی کوئی راہ گیر مڑ کر دیکھتا۔ تمام لوگ اس دُکان اور سلطان صاحب کے وجود سے بالکل بے خبر تھے۔ میں اکثر فرصت کے اوقات میں اُن کی دُکان پر جاتا پرانی کتابیں آدھی قیمت پر خریدتا اور پڑھتا۔ سلطان صاحب کا مطالعہ وسیع اور حافظہ غضب کا تھا۔ میں ان کے پاس جو لمحات گذارتا وہ میرے لیے بہت قیمتی ہوتے۔ وہ انگریزی ہو یا اردو شعراء و ادباء کی تخلیقات ان کے نقطہ نظر اور اُن کے حالات زندگی کے بارے میں اچھی خاصی جانکاری رکھتے۔ خود بھی شعر کہتے اور فریدی تخلص کرتے۔

آج میں نے جب کیٹس کی شاعری کی کتاب مانگی تو کہا۔

میں تمہیں اردو کے کیٹس کی کتاب دیتا ہوں،اسے پڑھو۔

پتہ چلا ان کی مراد اسرارالحق مجاز سے ہے۔پھر وہ مجاز کی زندگی کے بارے میں بتانے لگے۔

سنا! مجاز ہمیشہ ایسے نہیں تھے۔

وہ تو کافی خوش مزاج اور ذہین نوجوان تھا۔یاروں کا یار اور کافی ملنسار نوجوان۔شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ کمال کا حاضر جواب بھی تھا۔جب ترنم میں شعر پڑھ کر سناتا تو سننے والے عش عش کرتے۔ان کی شاعری تو اچھی تھی ہی آواز میں بھی جادو تھا۔علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا ایک ہونہار طالب علم۔مجاز کو سپورٹس میں بھی دلچسپی تھی خاص کر بیڈمنٹن تو اچھی کھیل لیتا تھا۔اُس کی شاعری اور ترنم کے چرچے پورے علی گڑھ اور سبھی کالجز میں تھے اِن چرچوں سے وہ کافی مشہور بھی ہوا۔

پھر ایک معصوم صورت کو دل میں بسایا جسے وہ کبھی بھی اپنا نہ بنا سکا۔اُسی معصوم صورت پر شعر کہتا اور لہرا لہرا کر رومانی غزلیں پڑھتا اور یہ بھول جاتا کہ وہ اس معصوم صورت کو کبھی بھی اپنا نہیں بنا سکتا۔

مجاز صرف حسن وعشق کا ہی پرستار نہ تھا بلکہ وہ تو کافی حب الوطن بھی تھا۔

اوہو.....اوہو.....اوہو۔

سلطان صاحب کھانسنے لگے اور اپنا گلا کھنکھارتے ہوئے پھر کہنے لگے۔

مجاز کو اپنے وطن سے بے حد محبت تھی۔

ایک دفعہ تو وہ بہت خوش تھا جب اُسے گاندھی جی کے سامنے اپنی شاعری سنانے کا موقع ملا۔وہاں پنڈت جواہر لال نہرو اور سروجنی نائیڈو بھی موجود تھیں۔

گاندھی جی سر جھکائے مجاز کی شاعری سنتے رہے۔ گاندھی جی کو مجاز کی نظم ''ننھی پجارن'' زیادہ پسند آئی۔ جب مجاز نے اس نظم کے آخری شعر پڑھے تو گاندھی جی نے سر اٹھایا اور مجاز کی طرف دیکھ کر مسکرائے اور بہت خوش ہوئے۔

اپنے وطن کا یہ شیدائی زبردست خوددار بھی تھا شاید اسی لیے اسے کوئی نوکری یا ملازمت راس نہیں آئی۔ ہاں البتہ کچھ مدت کے لیے آل انڈیا ریڈیو میں کام ضرور کیا لیکن اپنی خودداری کے باعث جلدی اُسے بھی چھوڑ دیا۔

ایک خوشی جو مجاز نے جی بھر کے سیلی بریٹ کی وہ تھی جب ہندوستان آزاد ہوا۔ ۱۹۴۷ میں آزادی کا پرچم لہراتے ہی مجاز سڑکوں پر گاتا ناچتا پھرنے لگا اور زور زور سے کہتا رہا:

بول اری او دھرتی بول
راج سنگھاسن ڈاماڈول
بول اری او دھرتی بول
راج سنگھاسن ڈاماڈول

ناکام محبت کے نشتر اُس کی روح میں پہلے ہی پیوست ہو چکے تھے اور اس کی جوانی کو مجروح کر دینا شروع کر چکے تھے۔ مجاز کی زندگی میں پہلے ہی ایک نازک موڑ آ چکا تھا جب وہ غمِ جاناں اور غمِ دوراں کو لال رنگ کے جام کے ساتھ ملا کر گٹا گٹ پی گیا اور تبھی اُس کی آوارگی کی اصلی بنیاد پڑ گئی۔ وہ لکھنؤ، دہلی، بمبئی گھوما پھرا۔ یاروں اور دوستوں کی محفلوں میں اپنا دکھڑا اپنے اشعار کے ذریعے سناتا رہا۔ سب سننے والے واہ واہ کرتے رہے پر اُسے جو غم اندر ہی اندر چاٹ رہے تھے کوئی اس کا مداوا نہ کر سکا۔ مجاز نے خود کہا۔

سب کا تو مداوا کر ڈالا اپنا ہی مداوا کر نہ سکے
سب کے تو گریباں سی ڈالے اپنا ہی گریباں بھول گئے

سلطان صاحب اپنی جگہ سے اٹھے اور مجاز کی کتاب ڈھونڈنے لگے۔ کتاب ڈھونڈتے ڈھونڈتے باتیں بھی کرتے رہے۔

وہ کہنے لگے:

بٹوارے سے جو افراتفری ہوئی اس نے بھی مجاز کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ نتیجہ ایک بار نہیں بلکہ دو بار نروس بریک ڈاؤن ہوا اور اُسے پاگل خانے میں بھی بھرتی ہونا پڑا۔ پاگل خانے سے نکلتے ہی پھر میخانے کا رخ کیا اور جب کسی نے میخانے میں کہا مجاز تم پھر یہاں۔ تو طنزیہ انداز میں جواباً کہا۔

فیض جیل خانے میں
منٹو پاگل خانے میں
اور مجاز میخانے میں
ارے ہم لوگوں کے یہی تو ٹھکانے ہیں۔

اور پھر خود ہی زور زور سے قہقہے لگاتا۔ پتہ نہیں اتنا اچھا شاعر کس قسم کی دھن میں جیتا رہا جو اسے شام وسحر اور شب وروز کا بھی خیال نہ رہا۔ مجاز نے نہ کبھی گھر بسایا اور نہ ذمہ داریاں ہی سنبھالیں۔ وہ اکثر اپنا یہ شعر کہتا:

زندگی کیا ہے گناہِ آدم
زندگی ہے تو گناہ گار ہوں میں

تمہیں کیا لگتا ہے سلطان صاحب نے سنجیدگی کے ساتھ مجھ سے کہا۔

کیا اُسے اس بات کا غم نہیں تھا۔ضرور تھا بلکہ اُس کے ادھورے خوابوں کی فہرست کافی لمبی تھی۔

ایک شام کو جب وہ لال رنگ کے جام سے غم غلط کر رہا تھا۔ اسے اپنی آوارگی اپنی بے ڈھنگ زندگی کا بے حد رنج ہوا اسے رہ رہ کر اپنوں کی یاد آتی رہی۔اسے ماں کا آنچل، باپ کی شفقت، گھر آنگن، اپنی بہن کی بہت ہمدردیاں یاد آتی رہیں اور وہ اشک بار بھی ہوا اور اس نے ارادہ کرلیا کہ وہ صبح ہوتے ہی یہ تمام آوارگی چھوڑ کر اپنے گھر، اپنوں کے بیچ واپس لوٹ جائے گا۔

سلطان صاحب اچانک چلائے ارے وہ رہی کتاب۔

ایک پھٹی پرانی کتاب میرے ہاتھوں میں تھماتے ہوا کہا۔

لو مجاز کی شاعری پڑھو۔ میں نے کتاب کا نام پڑھا ''آہنگ''۔

کتاب چونکہ پرانی تھی اسی لیے اس کی حالت بھی بہت خراب تھی۔ میں نے جیب سے پیسے نکالنے چاہے تو سلطان صاحب نے میرا ہاتھ روکا۔

حساب کتاب ہوتا رہے گا اور میں سلطان صاحب کی دکان سے نکل پڑا۔ چند ہی قدم چل کر میرے دل و دماغ میں یہ خیال آیا۔

کیا واقعی اس آوارگی کا کوئی انت ہوا؟

کیا مجاز اپنوں کے بیچ واپس لوٹ آئے؟

کیا انہوں نے اپنی زندگی کو سنبھالا؟

ان سوالوں کے جواب لینے کے لیے میں تیزی سے واپس مڑا اور سلطان صاحب کی دکان پر واپس گیا۔ جہاں پر وہ حسب عادت کوئی کتاب پڑھنے میں

مشغول تھے۔ مجھے دیکھتے ہی حیرت سے بول پڑے۔

کیا ہوا میاں۔

سلطان صاحب آپ نے کہا ہی نہیں۔کیا مجاز اپنی آوارگی چھوڑ کر واپس اپنوں کے بیچ لوٹ گئے۔

سلطان صاحب نے ایک لمبی آہ بھری اور کہا۔

مجاز نے جو ارادہ کیا تھا وہ پورا نہ کر سکا۔

آخر کیوں؟

میں نے کیوں پر زور ڈالتے ہوئے پوچھا۔

کیونکہ مجاز بے ہوشی کی حالت میں سردی سے ٹھٹھرتا ہوا رات کو ہی مر چکا تھا۔

کچھ دیر تک ہم ایک دوسرے کا منہ تکتے رہے اور تھوڑی ہی دیر بعد میں مجاز کی کتاب ''آہنگ'' کو سینے سے لگائے بازار سے گزر رہا تھا۔

☆☆☆

گِرگٹ

فیصلہ کرنا مشکل ہے۔

ہاں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ وہ میرا پیچھا کرر ہا ہے یا میں اُس کا۔

کیونکہ ہر اس جگہ جہاں میں ہوتا ہوں وہاں وہ بھی ہوتا ہے یا اس بات کو الٹا کر کے یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ ہر اُس جگہ جہاں وہ ہوتا ہے وہاں میں بھی ہوتا ہوں۔

وہ ہر ضروری جگہ کیوں ہوتا ہے میں نہیں جانتا ہوں۔ البتہ میں ہر اُس ضروری جگہ کیوں ہوتا ہوں یہ تو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ کیونکہ یہ میری مجبوری بھی ہے اور میرا پیشہ بھی۔ میں پیشے سے ایک پریس رپورٹر ہوں اور مجھے ہر وقت تلاش رہتی ہے، تلاش رہتی ہے، خبروں کی ۔تازہ اور گرم خبریں۔ یا پھر جو چاروں اطراف خبریں بکھری پڑی ہیں مجھے ان کو سمیٹنا ہوتا ہے اور وہ بھی جلد سے جلد۔ ورنہ خبریں مرجاتی ہیں۔ بقول ایک افسانہ نگار کے'' کہانیاں نہیں مرتیں خبریں مرجاتیں ہیں''۔

پر ہر جگہ جہاں کوئی خبر ہوتی ہے وہاں وہ بھی ہوتا ہے۔

وہ!

ہاں وہ!

کبھی الم اٹھائے کبھی سر جھکائے، کبھی احتجاج کرتے ہوئے کبھی تالیاں بجاتے ہوئے۔ کہیں ماتم کرتے ہوئے تو کہیں زور زور سے ہنستے ہوئے کبھی باغی کبھی محافظ، کہیں خاموش تو کہیں شور مچاتے ہوئے وہ مجھے نظر آتا۔

میں اُس کے ایسا کرنے سے اب پریشان رہنے لگا ہوں، بے حد پریشان۔

آخر..... آخر وہ کون ہے؟ کیا چاہتا ہے؟ اور اُس کا مطالبہ کیا ہے؟ وہ کیوں ہر جگہ ہوتا ہے۔ آخر کیوں؟.....

پھر جب میں تنگ آ گیا تو آخر کار ایک دن اُس سے آواز دے کر روکا اپنے پاس بلایا اور پوچھا۔

بھئی آخر تم کون ہو۔ کیوں ہر جگہ نظر آتے ہو۔ تمہاری شناخت کیا ہے۔

شناخت!

شناخت..... ہاں ہاں ٹھہرو۔

اُس نے بغیر کسی حیرانگی کے ''جیسے اُسے اِس سب کی عادت ہو''۔ بغل میں دبائے ہوئے تھیلے میں جھانکتے ہوئے کچھ ٹٹولنے لگا۔ پھر تھوڑی دیر میں میری طرف ایک ایک کر کے کچھ بڑھاتے ہوئے مخاطب ہوا جی یہ لیجئے۔

یہ کیا ہے؟

میری شناخت۔

مطلب؟

جی یہ میرا شناختی کارڈ، آدھار کارڈ، الیکشن کارڈ، راشن کارڈ پین کارڈ، کریڈٹ کارڈ، ڈیبٹ کارڈ، ڈرائیونگ لائسنس، پاسپورٹ، بجلی فیس رسید، پینے کے پانی کی رسید، بینک پاس بک، گیس کنکشن کتاب، اور ہاں یہ بھی سٹیٹ سبجیکٹ۔

کیا اتنا کافی ہوگا یا پھر.....

تمہارا مطلب ہے پی' آر' سی۔

نہیں نہیں..... وہ بوکھلایا ہوا بولا۔سٹیٹ سبجیکٹ۔

میں اُس کی معصومیت پر مسکرایا۔

کیا یہی تمہاری شناخت ہے۔

ہاں بالکل میں تو انہیں چیزوں سے پہچانا جاتا ہوں۔ان چیزوں کے بغیر میرا ہونے کا کوئی مطلب نہیں۔

میرے اپنے میرے ہونے کی گواہی مانگتے ہیں۔

میں نے حسرت سے تکتے ہوئے کہا۔

تم کتنے خانوں میں بٹ گئے ہو کہ اب کہیں سالم نظر ہی نہیں آتے۔اچھا سنو تم نے مجھے بےحد پریشان کر کے رکھ دیا۔میں نے تیور بدل کر بات کی۔

کبھی ہاتھوں میں پتھر لیے کھڑے ہو جاتے ہو تو کبھی..... کبھی خفا تو کبھی خوش۔

تم اتنے بھولے بھی نہیں کہ کوئی تمہیں بہکائے نہ اتنے سمجھدار کہ..... تم اور تمہاری ذات میری سمجھ سے باہر ہے۔

میں بھی کئی دنوں کی کوفت سے تنگ آ کر جی بھر کر اپنی بڑھاس نکالنے لگا۔

تمہیں..... تمہیں یا تو سب کچھ چاہیے یا..... یا پھر..... کچھ بھی نہیں۔

ہر بات پر جذباتی ہو جاتے ہو۔اُف.....

میں اُس کو کھری کھوٹی سناتے سناتے اچانک رک گیا اور مجھے خیال آیا کسی اجنبی شخص کے ساتھ اتنی سختی سے مخاطب نہیں ہونا چاہیے۔میں خاموش ہو گیا اور صرف اُسے تکنے لگا۔وہ بھی خاموش سنتا رہا۔بالکل خاموش اور ایک لمبی خاموشی

کے بعد بولا۔

جی مجھے اجازت دیجیے میں چلتا ہوں۔

میرے اندر عجیب کیفیت کا ایک ملا جلا سنگھم موجود تھا میں غصے میں بھی تھا اور اپنی اس جلی کٹی جو میں نے اسے سنائی اس پر نادم بھی مگر ایک بات جو میں نے اخذ کی وہ یہ کہ وہ واقعی شریف' بے حد شریف النفس..... ورنہ اتنا سب کچھ سننے کے بعد کوئی کہاں چُپ رہنے والا تھا۔

ہر طرف وہی افراتفری کا ماحول جو پہلے بھی تھا اب بھی نظر آ رہا تھا۔ سرحدوں پر دھول کے ساتھ ساتھ دھواں بھی اڑ رہا تھا۔ معصوم لوگوں کی ہلاکتیں برسوں سے ایک معمول بن کے رہ گیا تھا۔ روز کسی نہ کسی معصوم نوجوان کو موت کی آغوش میں سُلا دیا جاتا۔ اُس دن بھی وہی ہوا۔ کسی معصوم نوجوان کو موت کی آغوش میں سُلا دیا گیا۔ میں اس حادثے کو قلمبند کرنے کے لیے پہنچا تو دیکھا اُس معصوم کے جنازے میں وہ بھی شریک تھا۔ ہزاروں لوگوں کی بھیڑ جمع تھی اور سبھی لوگ کافی غم و غصے میں نظر آ رہے تھے۔ میں نے اُس تک پہنچنے کی کوشش کی اور کامیاب بھی ہوا۔ اُسے ایک طرف بھیڑ سے الگ کر کے لے گیا اور کہا۔

دیکھا!

اتنی بڑی قربانی۔

جانوں کا نذرانہ قربانی کی آخری حد ہے۔ یہ سب..... میں کہتے کہتے رُک گیا۔

ہاں بہت ہوا' وہ بول پڑا۔ اب بہت ہوا۔ ہر ایک چیز کی حد ہوتی ہے۔ وہ اشک بار آنکھوں سے کہنے لگا۔

جانتا ہوں میں دوراہے پر کھڑا ہوں۔ میں کیا ہم سب دوراہے پر کھڑے

ہیں۔ جہاں ہمارے پیچھے موت لگی ہے تو آگے کھائی ہے۔ دورا ہے پر ہی کیوں بلکہ ہم تو چورا ہے پر کھڑے ہیں اور اسی چورا ہے پر ایک ایک کر کے ہمیں دفنایا بھی جائے گا اور پھر ہماری سمادھی بھی بنادی جائے گی۔ پتہ ہے اس سمادھی پر گلہائے عقیدت چڑھانے والے کوئی اور نہیں بلکہ ہمارے ہی قاتل ہوں گے اور پھر مگرمچھ کے آنسو بھی بہائے جائیں گے۔ سب جانتا ہوں لیکن ..... اب بہت ہوا۔

کیا تم واقعی سنجیدہ ہو۔ مجھے تو ایسا نہیں لگتا۔ ان لاشوں پر ماتم کرنے والے بھی تم ہو اور ان کا.....

ٹھوکر مارنے والے بھی تم ہو اور ہاتھ پھیلانے والے بھی تم ہی ہو۔ قاتلوں کو مسیحا سمجھنے والے بھی تم ہی ہو۔

میں پھر جذباتی ہو گیا اور اس پر چلایا پھر مجھے یاد نہیں کہ میں غصے میں کیا کیا بول گیا اور وہ خاموش سنتا رہا۔ ہاں البتہ اتنا یاد ہے کہ آخر میں اس نے ایک بار صرف یہی کہا۔

بس اب بہت ہو گیا۔

میں اخبار کے دفتر میں بیٹھا خبروں کی نوک پلک سنوار رہا ہوں یا انہیں تراش خراش رہا ہوں یا پھر انہیں لوگوں تک پہنچانے سے پہلے انہیں اچھی طرح مرچ مصالحہ لگا کر انہیں تیار کر رہا ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ اس سوچ میں بھی غوطہ زن ہوں کہ وہ اب کہیں بھی نظر نہیں آتا۔ جس کی وجہ صرف اور صرف میں ہوں۔ کیونکہ میرے غصہ ہونے کی وجہ سے ہی وہ.....

میں نے اُس کے بارے میں پتہ کرنے کی کافی کوشش کی لیکن..... کسی نے کہا کہ ہم نے اس سے آخری بار سہارا بلڈنگ کی اوپری منزل یا پھر چھت سے نیچے

کی طرف تکتے ہوئے دیکھا۔ تو کسی نے کہا ہم نے اُس سے ریلوے ٹریک پر مایوس بیٹھا دیکھا تو کسی نے کہا اُس کو بازار سے کوئی زہریلی شئے خریدتے ہوئے دیکھا گیا۔ تو کسی نے کہا کہ اُسے پُل پر سے نیچے بہتے پانی کو تکتے ہوئے دیکھا گیا۔

میرے پاس اُس کے لاپتہ ہونے کی کوئی مصدقہ اطلاع بھی نہیں ہے کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو اب تک یہ خبر مجھ تک کسی نہ کسی ذریعہ پہنچ گئی ہوتی۔ میرا اُس کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں اور نا ہی میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ میرا دوست ہے۔ لیکن اب اُس کی غیر موجودگی مجھے بری طرح کھلتی ہے۔ کہیں اُس نے میری وجہ سے کوئی ایسا قدم تو نہیں اٹھایا ہو جس سے مجھے.....

مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ مجھے اُس پر اتنا غصہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ آخر..... آخر وہ میرا کون تھا۔ اب میں اپنے آپ کو کوستا رہتا ہوں۔

میں بڑی عجلت اور پھرتی سے جلسہ گاہ پہنچ گیا۔

ایک بہت بڑا جلسہ ہونے جا رہا ہے اور میں صحیح وقت پر پہنچ گیا ہوں۔ بڑے منتری جی بھاشن دے رہے ہیں۔ لوگ اُن کی باتوں کو بڑے غور سے سُن رہے ہیں اور وہ لوگوں کو سبز باغ.....

خوشحالی، ترقی

بے روزگاروں کے لیے روزگار۔

پیٹ بھر کھانا۔

پانی، سڑک، بجلی اور نہ جانے کیا کیا۔

خیر مجھے کیا..... مجھے تو ساری کاروائی قلمبند کرنی ہے۔ یہی میرا پیشہ بھی ہے۔ مگر اتنی ساری بھیڑ میں میری نظریں اسی کو ڈھونڈ رہی ہیں پر وہ کہیں بھی نظر نہیں

آ رہا ہے۔

وہ.....

آخر وہ..... آخر وہ سمجھ ہی گیا کہ.....

میں اب کافی مطمئن ہوں وہ شاید کوئی بڑا فیصلہ کرنے کی تیاری میں ہو۔ جلسہ ختم ہونے کو تھا اور میں بڑے اطمینان کے ساتھ واپس لوٹ رہا تھا۔ جلسے میں ایک نئی رونق اور نیا جوش وخروش دیکھنے کو ملا۔ ہر طرف نعرے بازی ہو رہی تھی زندہ باد زندہ باد کے نعرے چار سو گونج رہے تھے۔ میں یہ منظر دیکھنے کے لیے چلتے چلتے رک گیا اور ایک بار مڑ کر دیکھا میرے قدموں تلے زمین کھسک گئی اور میں شرمندگی اور حیرانگی کے ملے جلے دَلدل میں دھنستا چلا گیا کیونکہ جلسے میں نئی روح پھونکنے والا اور زندہ باد کے نعرے دینے والا کوئی اور نہ تھا بلکہ وہ.....ہاں وہی تھا۔ یک لخت میرے منہ سے نکل گیا..... گِرگٹ۔

☆☆☆

یادوں کا موسم

(عمر مجید کی یاد میں)

یادوں کے موسم کا کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا۔

یہ موسم تو کبھی بھی چلا آتا ہے۔

یادیں تو وہ بادل ہیں جو کبھی بھی کہیں بھی برستے ہیں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے جیسے یہ بھی کل ہی کی بات ہو۔ پاپا نے مجھے اپنے سائیکل پر بٹھایا اور چل دیئے۔ پاپا نے سفید کُرتا پاجامہ اور بلیو کلر کی سویٹر پہنی تھی۔ہم سائیکل پر جارہے تھے اور تب میں نے راستے میں پاپا سے پوچھا۔

پاپا ہم کہاں جارہے ہیں۔

درگاہ۔

درگاہ!

ہاں ہاں! درگاہ حضرت بل۔

کیوں؟

حاضری دینے اور مجھے کچھ تمہیں دکھانا بھی ہے۔

میں نے تھوڑی دیر بعد پاپا سے پھر سوال کیا۔

پاپا آپ سکول میں کیا پڑھاتے ہیں۔

''الف'' سے اللہ ''ب'' سے بسم اللہ' پاپا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

میں سمجھا نہیں۔

ایک شہد سی میٹھی چیز بچوں کے کانوں میں گھولتا رہتا ہوں۔

مطلب۔

بیٹا مطلب یہ' میں انہیں اردو پڑھاتا ہوں۔

جواب سن کر پتا نہیں کیوں اب کی بار میں مسکرایا۔ میں نے پھر سوال کیا۔

آپ راتوں کو دیر دیر تک جاگتے رہتے ہیں اور لکھتے رہتے ہیں۔ایسا کیوں؟ پاپا میرا سوال سُن کر پہلے سوچنے لگے پھر کچھ سوچ کر جواب دیا۔

یہی میرا مقدر ہے اور یہی میرا فرض بھی۔

مقدر کیوں؟

کیوں کہ میں ایک استاد ہونے کے ساتھ ساتھ قلم کا سپاہی بھی ہوں۔

اور فرض کیوں؟

اور فرض اس لیے کیونکہ ایک شاعر نے کہا ہے ۔

قلم کے سپاہی اگر سُو گئے تو

وطن کے مسیحا وطن بیچ دیں گے

میں سمجھا نہیں۔

کوئی بات نہیں جب تم بڑے ہو جاؤ گے اور میری لکھی تحریریں پڑھو گے تو خود بخود سمجھ جاؤ گے۔

پاپا کی کہی باتیں کچھ میرے پلے پڑتیں کچھ نہیں کیونکہ تب میری عمر چھ یا سات سال کی ہوگی۔ ہاں البتہ اتنا ضرور تھا مجھے پاپا کی کئی خوبیوں کے بارے میں

تھوڑا تھوڑا تب پتا چلنے لگا جب مجھ سے کوئی پوچھتا کہ تم کس کے بیٹے ہو' تو میں کہتا عمر مجید کا تو لوگ کہتے اچھا وہی عمر مجید جو کتھائیں لکھتے ہیں۔ اچھا وہی عمر مجید نا جو اخبار آفتاب میں کالم لکھتے ہیں' اچھا وہی عمر مجید جو بسکو سکول میں استاد ہیں۔

درگاہ حضرت بل میں حاضری دے کر جب ہم باہر نکلے تو جھیل ڈل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پاپا نے کہا۔

دیکھو ساجد یہ جھیل ڈل ہے۔ جو برسوں سے اس پاک درگاہ کے پاؤں دھو رہی ہے اور اجرِ عظیم کما رہی ہے۔ اسی جھیل کے ماتھے پر پری محل کا تاج سجا ہے۔ اور اس کی گود میں چار چنار کا سایہ بسا ہے۔ زبرون کی پہاڑیاں ہی نہیں بلکہ سارے پربت' سارے کوہسار مجھے اچھے لگتے ہیں۔ مجھے تو یہ ساری وادی پیر پنچال سے لے کر لولاب تک ایک جنت نشاں سی وادی لگتی ہے اور مجھے اپنی اس جنت سے بے حد محبت ہے۔

کچھ دیر بعد ہم واپس لوٹ رہے تھے میں نے دیکھا چند لڑکے رنگ بہ رنگی پتنگیں اڑا رہے تھے۔ میں نے پاپا سے کہا گھر جا کر میں بھی پتنگ اڑاؤں گا۔

کیوں نہیں' میں تمہارے اور عارف کے لیے لے آؤں گا' لیکن یاد رہے پتنگ اڑانے سے پہلے یہ یقین کر لینا ضروری ہے کہ پھرکی میں بندھا دھاگا کہیں کٹا ہوا تو نہیں ہے۔ ورنہ یوں ہوگا تم پتنگ اڑا رہے ہو گے اور اچانک پتنگ تمہارے کنٹرول سے چھوٹ کر کہیں کھو جائے گی اور گم ہو جائے گی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پاپا کی کہی باتیں سمجھ میں آتی گئیں۔

میں جوں جوں بڑا ہوتا گیا میں نے پاپا میں کئی خوبیاں ایک ساتھ پائیں۔ ایک شفیق باپ' ایک کامیاب استاد' ایک خوب صورت تخلیق کار' ایک سنجیدہ اور پُر وقار

شخص، یاروں کا یار، اپنے پرائے سب کا غم خوار، بلند قد، بڑی بڑی آنکھیں، سوچ میں ڈوبا ہوا چہرہ، بہت پڑھتے، بہت سنتے لیکن بہت کم بولتے، اپنے پیشے سے وفاداری کے ساتھ ساتھ کتھائیں بھی لکھتے اور اخبار کے لیے کالم بھی، جنت جیسی وادی سے بے حد محبت کرتے اور بار بار اس کا اظہار بھی۔

پر! پر کسے پتہ تھا برسوں گزر جانے کے بعد روزنامہ آفتاب میں چمکنے والا یہ آفتاب کچھ بجھ سا جائے گا کیونکہ اس کی جنت جیسی وادی کہیں کھو گئی وادی میں حالات خراب ہونے لگے اور موت کا زہر ہر سو ہواؤں میں پھیلنے لگا یہاں تک کہ سانس لینے میں بھی دشواری ہونے لگی۔

لال چوک سے سونہ وار تک کا راستہ صرف دس منٹ کا ہے۔ پر پاپا کو یہ مسافت طے کرنے میں دس برس سے بھی زیادہ عرصہ لگا۔ ایسا بھی نہیں کہ ان دس برسوں میں پاپا گھر واپس نہ لوٹیں ہوں مگر یہ الگ بات ہے کہ ان دس برسوں میں جو روز شام کو گھر لوٹ آتے وہ پاپا نہیں بلکہ کوئی اور ہوتا۔ بجھا بجھا سا چہرہ، حیران پریشان سی حالت۔

کہتے ہیں پاپا اپنے کلاس روم میں بچوں کو پڑھا رہے تھے کہ سکول کے باہر سڑک پر زوردار دھماکہ ہوا جس سے کچھ لوگ زخمی ہوئے۔ ایک شخص جو شدید زخمی ہوا، کو پاپا نے کسی طرح گھسیٹتے ہوئے سکول کے احاطے میں لایا وہ شخص خون میں نہایا ہوا تھا اور اس نے پاپا کی گود میں دم توڑ دیا وہ کوئی اجنبی نہیں بلکہ ہمارے ہی محلے کا ہمارا پڑوسی عبدالخالق تھا۔ اس حادثے کی وجہ سے پاپا کو گہرا صدمہ ہوا وہ یہ منظر کئی برسوں تک بھلا نہ سکے۔ نتیجہ وہ مسکرانا تک بھول گئے۔ ہر ایک چیز کو اجنبی نظروں سے دیکھنے لگے۔ جیسے ہر چیز کا نیا تعارف چاہتے تھے لکھنے پڑھنے سے بھی کترانے لگے۔ یہ ایک

تخلیق کار کی شکست ہر گز نہیں تھی بلکہ ایک تخلیق کار کا کرب ضرور تھا جسے وہ اکیلے ہی جھیل رہے تھے۔

پھر برسوں کے بعد ایک دن جیسے کوئی کرشمہ سا ہو گیا۔ پاپا کے دوست جاوید انکل نے پتا نہیں کیسے پاپا کو پھر قلم اٹھانے پر راضی کر لیا۔ شبدوں کے مہرے پھر بچھائے گئے اور وہ ایک ماہر کھلاڑی کی طرح شبدوں سے کھیلنے لگے اور یوں ایک پرانا موسم واپس لوٹا، گمشدہ جنت کے واسی نے پہلے بھی بہت کچھ لکھا تھا اور پھر دوبارہ سے لکھنا شروع کیا۔ شہر کا اغواہ میری گلی کا غم اور بہت ساری کتھائیں.....

پھر پاپا نے ایک دن اپنی خواہش کا اظہار کچھ یوں کیا۔

ساجد، میں چاہتا ہوں کہ اب میری کتاب منظرِ عام پر آئے۔

افسوس میں نے پاپا کی یہ خواہش وقتی طور اس لیے ٹال دی کیونکہ مجھے اس کے لیے کوئی جلدی نہیں تھی میں نے کہا، پاپا کوئی بات نہیں اس کے بارے میں سوچتے ہیں اور میں سوچتا ہی رہ گیا حالانکہ پاپا اکثر کہتے تھے زیادہ سوچنے سے ارادے کمزور پڑ جاتے ہیں۔ مجھے تو جلدی نہیں تھی لیکن پاپا کو جلدی تھی بہت جلدی۔

جاڑے کی خشک سردی کا دن تھا، نرم نرم دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ میں سونہ وار کی گلیوں سے اپنے پاپا کا جنازہ کاندھوں پر لیے ایک ہجوم کے ساتھ جا رہا تھا اور اس طرح اوروں کی کتھائیں لکھنے والے میرے پاپا خود ایک کتھا بن کر صدیوں کے لیے امر ہو گئے۔

ایک سرد ہوا کا جھونکا آیا اور میرے تمام بدن میں ایک جھرجھری سی ہوئی میں نے دیکھا، یادوں کا موسم جوبن پر تھا اور یادوں کے کئی بادل جم کے برس رہے تھے اور میں کافی دیر سے بھیگ رہا تھا۔ ☆☆☆

ادھورے سپنے

گیلے کاغذ پر لکھا نہیں کرتے۔
جانتی ہوں اماں۔
پر میں نے دل کے لیے گیلے کاغذ پر محبت کی کہانی لکھی۔
تحریر تو باقی نہیں رہی فقط سیاہی کے دھبے رہ گئے ہیں۔
اب اداسی کے ساحل پر بیٹھی غموں کی ریت نچوڑتی رہتی ہوں۔
خطا میری تھی۔
سزا بھی میں ہی بھگتوں گی۔
پر یقین مانو اماں
میں نے..... میں نے یہ جان بوجھ کر نہیں کیا۔
بس..... بس ہو گیا۔
تمہیں تو پتہ ہے اماں۔
میں روز گیسٹ ہاؤس میں آ کر ٹھہرے مہمانوں کے لیے پھولوں کے گلدستے تیار کر کے لے جاتی تھی اور بدلے میں وہ مہمان کچھ روپے بخشش دیتے تھے۔
پھر.....!!
پھر ایک دن جب میں گیسٹ ہاؤس پہنچی تو وہاں کچھ نئے مہمان آئے

ہوئے تھے اور وہ..... وہ..... پردیسی بابو بھی آیا تھا۔ ہاں ہاں اماں وہی پردیسی بابو' جس کی پہلی ہی نظر میری روح تک اُتر گئی۔ وہ..... وہ مجھے عجیب نظروں سے گھورتا رہا اور میں نادان بھی اُسے تکتی رہ گئی۔

میں نے تازہ پھولوں سے بنایا گلدستہ پیش کیا۔ پر وہ پردیسی بابو پھولوں کے بجائے صرف مجھے ہی دیکھتا رہا اور بخشش دینا بھی بھول گیا۔ پر..... پر میں کچھ کہہ نہ سکی جیسے میرے منہ میں زبان نہ ہو۔ پھر سوچا شاید گلدستہ پسند نہ آیا ہو اور میں گھبرائی ہوئی لوٹ آئی۔ اگلے روز پہلے سے بھی بڑا خوب صورت رنگ برنگے پھولوں کا گلدستہ تیار کر کے لے گئی اور گھبراتے ہوئے انہیں پیش کیا اور پتہ نہیں کیسے ہمت جٹا کر پوچھ بیٹھی۔

حضور! خوب صورت ہے نا

تم سے زیادہ نہیں۔

ہائے میں مرگئی' پانی پانی ہوگئی۔ چاہا کہیں ڈوب کے مرجاؤں یا پھر منوں مٹی تلے دفن ہوجاؤں۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے چہرے کو چھپالیا اور بھاگ چلی آئی۔

اُس دن میرے ذہن میں عجیب ہلچل رہی۔ کچھ بھی سمجھ نہ پائی کہ مجھے کیا ہورہا ہے۔

اماں مجھے یاد ہے آپ نے کہا تھا۔

''ان رشتوں کی بنیاد کھوکھلی ہوتی ہے جو رشتے جذبات میں آ کر
قائم کیے جاتے ہیں''۔

جانتی ہوں اماں پر.....

اگلے روز نہ چاہتے ہوئے بھی میرے قدم گیسٹ ہاؤس کی طرف چل

پڑے اور میں نے پھر پھولوں کا گلدستہ اپنے ساتھ لیا اور پردیسی بابو کو پیش کیا اور اپنے جذبات پر قابو رکھتے ہوئے ہمت کے ساتھ کہا۔

جی وہ میری بخشش۔

ہاں ہاں کیوں نہیں پھر پردیسی بابو انگریزی میں اپنے آپ سے کچھ بڑبڑانے لگا اور جیب سے بہت سارے روپے نکالے اور میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

اٹھاؤ جتنی مرضی ہے۔

پر تھوڑی دیر کے لیے یہیں رُک جاؤ۔

اُف خدایا' اس پردیسی بابو کی نیت میں کیسی کھوٹ ہے۔ اگر اس نے کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو روپے اس کے منہ پر ماروں گی اور بھاگ جاؤں گی۔ پھر اُس نے جلدی ہی میری غلط فہمی دور کر دی اور کہا۔

وہ... وہاں اُس چٹان پر تھوڑی دیر کے لیے بیٹھی رہو۔ تیری تصویر بنانی ہے۔

تصویر! میں نے اطمینان کا سانس لیا اور بے شرمی سے ہنس پڑی اور خود ہی شرمندہ بھی ہوئی اور پھر میں نے پوچھا۔

کیوں حضور آپ کے پاس وہ ڈبہ نہیں جس سے تصویر کھینچتے ہیں۔

ہاں ہے تو پر تم نہیں سمجھو گی۔ یہ ایک کلا ہے ایک آرٹ ہے۔

پر مجھے دیر ہو جائے گی۔

نہیں نہیں بالکل نہیں بس تھوڑی ہی دیر میں تصویر تیار ہو جائے گی۔

پھر اُس نے ایک موٹے کاغذ کو لکڑی کی بنی ہوئی کھونٹی پر ٹانک کر باندھا۔ رنگوں کے ڈبوں کو جلدی جلدی آپس میں ملایا اور ایک لمبے بڑے سے قلم جس کے آگے چھوٹے چھوٹے بال سے لگے تھے کو رنگوں میں ڈُباتا گیا اور کاغذ پر آڑی ترچھی

لکیریں کھینچتا گیا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ مجھے تو گھر جانے کی جلدی تھی بس اُس پردیسی بابو کا دل رکھنے کے لیے وہاں بیٹھی رہی اور پھر واقعی میری تصویر بن گئی۔

اماں پھر جب بھی میں اُس سے ملتی وہ شاعری میں باتیں کرتا، رنگوں سے کھیلتا رہتا اور میری طرف عجیب نظروں سے دیکھتا رہتا اور یوں وہ میرے دل میں بستا گیا اور میں خود سے دور ہوتی گئی۔

پھر ایک دن جب ہم ساتھ ساتھ پہاڑی سے وادی کی اور جانے والے راستے کی طرف نکل پڑے تو میں نے اس کی توجہ وادی کی اور پھیر دی اور کہا۔

میں اکثر سوچتی رہتی ہوں ان لکیروں جیسی بنی راہوں کی دوسری طرف ایک حسین بے حد حسین اور پیاری وادی ہوگی بالکل آپ کی طرح۔

وہ ہنس دیا اور جواباً کہا۔

کیا تم کبھی بھی وہاں نہیں گئی ہو۔

نہیں۔ میں نے مایوس ہو کر سر کو نفی میں ہلایا۔

تب پتہ ہے اماں پردیسی بابو نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا اور کہا۔

میں تمہیں وہاں لے جاؤں گا جہاں سے میں آیا ہوں یہ میرا وعدہ رہا۔

پھر میں شرما گئی بہت دیر تک مارے شرم کے پردیسی بابو سے نظریں نہیں ملا پائی۔

پھر ایک دن جب میں صبح سویرے پھولوں کا گلدستہ لے کر گیسٹ ہاؤس گئی تو دیکھا پردیسی بابو اپنا سامان موٹر میں رکھ رہا تھا۔

حضور آپ.....

ہاں ہاں میں جا رہا ہوں پر مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔

دیکھو میں واپس آؤں گا اور تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ مجھے اپنا وعدہ یاد ہے۔

پھر تھوڑی ہی دیر میں موٹر لکیروں جیسی راہوں سے آوازیں دیتی اور دھول اڑاتی ہوئی نیچے وادی کی اور جارہی تھی اور میری آنکھوں سے اشکوں کی دھار بہہ رہی تھی۔

ہاں اماں میں اب بھی وہیں کھڑی ہوں اُسی موڑ پر بالکل تنہا اِسی انتظار میں کہ پردیسی بابو.....

اماں یہ سب باتیں تم سے نہیں کہوں گی تو پھر کس سے کہوں تم جانتی ہو میری کوئی سہیلی نہیں سکھی نہیں۔ ہاں تم ہی' ہاں تم ہی تو میری سہیلی ہو میری سکھی ہو۔ میں بچپن سے آج تک تم ہی سے تو کہتی آئی ہوں اپنی ہر بات' اپنی ہر خوشی' اپنا ہر غم اور تمہاری کہی ہوئی ہر بات مجھے اب بھی یاد ہے اور ہر بات میرے لیے اندھیرے میں روشنی کا کام کرتی ہے پر.....

پر اماں..... کبھی کبھی انسان اپنے ہی دل کے آگے ہار جاتا ہے' مجبور ہو جاتا ہے۔

پھر اچانک موٹر کی آواز کہیں سے سنائی دی۔

سنو۔

سنو اماں غور سے سنو۔

وہ..... وہی موٹر کی آواز.....

ہاں ہاں اُسی موٹر کی آواز.....

چاروں اور اونچی اونچی دیواریں تھیں اور ایک دروازہ۔

دروازہ کھولو..... ارے کوئی دروازہ کھولو۔

م..... مجھے..... مجھے اپنے پردیسی بابو سے ملنا ہے دیکھو وہ آ گیا۔

ارے کوئی دروازہ تو کھولو۔

پھر وہ زور زور سے دروازے پر سر پٹکنے لگی۔

ہسپتال کی نرس دوڑتی ہوئی ڈاکٹر کے کمرے میں آئی اور کہا۔

ڈاکٹر وہ اُس مریضہ کو پھر سے دورہ پڑا ہے جلدی چلئے۔

وارڈ بوائے اور نرسوں نے اُسے پکڑے رکھا اور اس کے ماتھے پر شاک دینے والا کانٹوں کا تاج رکھا گیا اور وہ ایڑیاں رگڑتی رہی۔

اُس کے ہاتھ سے اُس کی اماں کی تصویر جس کے ساتھ وہ ابھی ابھی باتیں کر رہی تھی، چھوٹ کر فرش پر گر پڑی۔

تصویر میں اُس کی اماں کے ساتھ وہ شخص بھی تھا جس شخص کے واپس لوٹنے کے انتظار میں اُس کی اماں برسوں پہلے پاگل ہو کر دم توڑ چکی تھی۔

☆☆☆

اپنی بستی اپنے لوگ

کچھ لوگ زمانے میں عجیب سے روگ پالے ہوئے ہوتے ہیں۔

کچھ ایسا ہی ماسٹر جی کے ساتھ بھی تھا۔ میں جب اپنی بھاگ دوڑ بھری زندگی میں صبح سویرے 8:25 کی گاڑی پکڑنے کے لیے جلدی جلدی تیار ہو کر وقت پر ڈیوٹی پہنچنے کی غرض سے گھر سے نکلتا باہر سامنے گلی میں یا پھر آگے نکڑ پر ماسٹر جی کا ملنا میرے معمول میں شامل تھا۔ وہ اکثر رشید ہیر کٹنگ شاپ کی دکان کے نزدیک یا پھر مشتاق ٹیلرنگ کی دکان کے تھڑے پر محلّہ کے کسی ہم عمر بڑے بزرگ سے بات کرتے ہوئے نظر آتے انہیں دیکھتے ہی ان کے نزدیک جا کر ادب سے سلام کرتا وہ میری طرف مسکرا کر دیکھتے سلام کا جواب دیتے اور کہتے کیوں بیٹا آفس جا رہے ہو جاؤ اللہ نگہبان ہے میں ان کی دعائیں لے کر آگے بڑھ جاتا۔ کبھی کبھار ان کی اور ان کے دوسرے گھر والوں کی خیریت بھی پوچھتا۔

ماسٹر جی کے گھر کے ساتھ میرے قریبی تعلقات تھے وہ اس لیے کیونکہ میری دوستی ان کے اکلوتے بیٹے انور کے ساتھ تھی۔ انور اور میں محلّہ کے پرانے سکول سے لے کر کالج تک ایک ساتھ پڑھے تھے۔ انور نے پڑھائی ختم کر کے اپنے گھر کے ماحول سے بالکل برعکس بزنس میں دلچسپی لی اور میں نے ایک قلیل رقم کے عوض اپنی آزادی بیچ ڈالی اور سرکاری نوکری میں آ گیا۔ انور کی محنت اور تقدیر نے جلد ہی

رنگ دکھانے شروع کر دیئے اور بہت کم مدت میں انور نے کافی روپے پیسے کمائے‘ شادی کر ڈالی ایک اچھی سی گاڑی خریدی اور سول لائنز ائریا میں ایک اچھی سی کالونی میں نیا مکان بھی بنا ڈالا۔ انور نے اپنے والدین یعنی ماسٹر جی‘ ماں‘ بیوی اور اکلوتے بیٹے سمیت تقریباً چھ مہینے پہلے نئے مکان میں شفٹ کیا۔ مگر حیرانگی کی بات جو تھی وہ یہ کہ ان چھ مہینوں میں شاید ہی کوئی دن ایسا گذرا ہوگا جب ماسٹر جی اپنے محلے میں نظر نہ آئے ہوں۔ محلے والے جب گھروں سے نکلنا شروع ہوتے تو ماسٹر جی کو سفید کرتے پاجامے‘ بھوری رنگ کی صدری اور کالا موٹا چشمہ پہنے ہوئے گلی میں یا نگڑ پر کسی بند دکان کے تمڑے پر موجود پاتے اور اگر کبھی ٹھنڈ ہوتی تو ایک لمبا سا فرن ڈالے ہوئے نظر آتے اور پھر جب کوئی سوال کرتا ماسٹر جی خیریت تو ہے صبح سویرے یہاں کیسے تو ہر بار اطمینان کے ساتھ نئی وجہیں بتاتے۔

ایک دفعہ رشید نائی نے پوچھا ماسٹر جی کچھ خریدنے آئے ہیں کیا؟

تو ماسٹر جی نے جواب دیا۔

بھئی رشید کل پتہ نہیں گھر والے کہاں سے ساگ لے آئے تھے‘ بیچاری بہو نے بڑی محنت سے پکایا تھا مگر ایک دم بے مزہ ساگ تھا۔ بھئی ماننا پڑے گا ہمارے یہاں زُون دید کے پاس لائے ہوئے ساگ کے تو کیا کہنے انسان کھائے تو انگلیاں چاٹتا رہ جائے۔

اور ایک بار میں نے ماسٹر جی سے پوچھا کیوں ماسٹر جی زُون دید سے سبزی خریدنے آئے ہیں کیا تو بولے ارے نہیں نہیں تمہارے دوست کو اتنی فرصت کہاں کہ گھر کے لیے کچھ خریدے آج گھر میں سب کا من چاہا کہ مچھلیاں پکائی جائیں تو میں نے سوچا چلو گُلہٖ ڈار سے مچھلیاں لے آئیں ہمارے گُلہٖ ڈار کی مچھلیوں کا بھلا جواب ہے کہیں۔

گُلہ کاک کی مچھلیوں کا ذکر چھڑتے ہی میرے منہ میں بھی پانی آ گیا یہ سب باتیں اب روز کا معمول تھیں۔

پر کچھ دنوں سے ماسٹر جی کے چہرے پر عجیب سی اداسی چھائی ہوئی تھی۔ میں خود بھی پریشان ہو گیا کہ آخر وجہ کیا ہے کہ ماسٹر جی اس طرح اداس نظر آتے ہیں پھر ایک دن میں گھر کے آنگن میں کھڑے کھڑے پتہ نہیں کن سوچوں میں گم تھا میں نے دیکھا آنگن کے ادکھلے مین گیٹ کے باہر ماسٹر جی ہمارے گھر کو لگا تار گھور رہے ہیں، میں جلدی جلدی گیا اور ماسٹر جی سے کہا۔

چلئے ماسٹر جی اندر آئے کچھ کھا پی لیجئے۔

میری آواز سن کر جیسے نیند سے جاگے کیونکہ وہ کسی خاص گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔

نہیں نہیں بیٹا میں اندر نہیں آؤں گا میں تو تمہارے گھر کی ڈب (ڈھالان) کو دیکھ رہا تھا۔ تمہارے والد مرحوم اللہ انہیں جنت نصیب کرے وہ اور میں اس ڈب (ڈھالان) پر اکثر گھنٹوں بیٹھے نمکین چائے کی چسکیاں لیتے رہتے اور جہاں بھر کی باتیں کرتے بے شمار باتیں کبھی ختم نہ ہونے والی باتیں۔ تمہارے والد کو سب بچوں سے کتنی محبت تھی اور محلے کے سبھی بچے اُسے پیار سے بب جان کہہ کر پکارتے آج اس ڈب (ڈھالان) پر جب نظر پڑی تو قدم خود بہ خود رُک گئے اور پرانے دن یاد آ گئے۔ تمہاری والدہ اسی ڈھالان پر خزاں کے موسم میں ہری سبزیاں سُکھاتی خاص کر ٹماٹر اور شلغم اور پھر وہی سبزیاں سردیوں میں استعمال کرنے کے لیے پڑوسیوں میں بانٹتی پھرتی۔ ایک لمبی آہ بھر کر ماسٹر جی نے کہا اچھا رہنے دو یہ سب پرانی باتیں ہیں میں اب چلتا ہوں۔

ماسٹر جی ابھی جانے ہی والے تھے کہ میں نے آگے بڑھ کر ماسٹر جی کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ہاتھوں میں لیا اور ہمت جٹا کر پوچھا

ماسٹر جی سچ بتایئے آخر کیا بات ہے؟

میرا سوال سن کر وہ سوچ میں ڈوب گئے چہرہ کچھ اور اتر گیا اور میرے سوال کو ٹالنے کی کوشش کرتے ہوئے بولے۔

کیا بات کون سی بات کچھ بھی تو نہیں۔

دیکھئے ماسٹر جی میں بھی انور کی طرح آپ کا بیٹا ہوں کہیے نا کیا بات ہے کچھ دنوں سے آپ بے حد مایوس نظر آرہے ہیں آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔

طبیعت تو ٹھیک تھی اب شاید.....

کیا مطلب۔

بیٹا سچ کہوں تو میرا نئے گھر اور اس کالونی میں جی نہیں لگتا۔ وہاں کچھ بھی تو نہیں، نہ اپنی بستی نہ اپنے لوگ، نہ اپنا پن نہ شادمانیاں نہ کوئی چہل پہل اور نہ کوئی رونق۔ وہاں لوگ اپنے مرمر کے سلوں میں قید ہوکر رہتے ہیں۔ وہاں صرف خاموشی ہے ہر سو سناٹا ہے۔ بیٹا تم یقین نہیں کرو گے وہاں جب چاند چمکتا ہے تو اس کی روشنی پھیکی معلوم ہوتی ہے اور جب دھوپ پھیلتی ہے تو وہ بھی اداس اداس سی ہوتی ہے۔ میں نے اپنی زندگی کے ساٹھ سال اپنی بستی اپنے لوگوں کے درمیان گذارے۔ فتح محمد، محمد رمضان، ماسٹر سلام الدین اور تمہارے والد کے ساتھ زندگی کے سکھ دُکھ کے دن مل بانٹ کر گذارے، اب اس عمر میں نئی بستی اور نئے لوگوں کے درمیان بالکل اجنبی پن لگتا ہے۔ ماسٹر جی کی آواز رندھی ہوئی تھی اور پھر دھیرے دھیرے بالکل بچوں کی طرح رونے لگے اور روتی ہوئی آواز میں کہنے لگے مجھے اپنا

گھر، اپنی بستی اور اپنے لوگ بے حد یاد آتے ہیں۔میں نے ماسٹر جی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

یہ تنہائی اور اپنے رشتوں سے دوری کا غم فقط آپ ہی کا حصہ نہیں ہے بلکہ ہم سب اسی غم کے حصے دار ہیں۔رشتوں کا سورج ابھی بھی چمکتا ہے، یہ الگ بات ہے اب اس میں حرارت نہیں رہی۔

تم ٹھیک کہتے ہو بیٹا لیکن وہاں پہنچتے ہی میرا من بھاری ہوجاتا ہے پھر رات کانٹوں کے بستر پر کاٹ کر صبح سویرے یہاں واپس لوٹ آتا تھا لیکن اب انور نے یہاں پر آنے کے لیے روک لگادی ہے، کہتا ہے کہ اگر کوئی دیکھے گا کہ اتنے بڑے بزنس مین کا باپ دکانوں کے تھڑوں پر بیٹھے گپ مارتا ہے تو میری عزت کیا رہ جائے گی۔تمہارا دوست کافی بدل چکا ہے۔اُسی نے مجھے مجبور کیا اور مجھے یہاں کا پرانا مکان بیچ ڈالنا پڑا۔حالانکہ پرانے گھر کے پاس ایک ٹکڑا زمین کا ابھی بھی، میرا ہی ہے میں نے وہ بیچا نہیں۔

ماسٹر جی اگر آپ اجازت دیں تو میں انور سے بات کرتا ہوں۔

نہیں نہیں بیٹا ماسٹر جی اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولے، جو انور اس بستی میں ان گلیوں میں کھیلتے کودتے بڑا ہوگیا اب وہی انور ڈاؤن ٹاؤن کے نام سے بھی چڑتا ہے۔میں ماسٹر جی کی حالت دیکھ کر بے حد پریشان ہوا یہاں تک کہ میری بھی آنکھیں نم ہوئیں۔

پر اب کیا ہوگا اس مسئلے کا کوئی حل.....

حل نکلے گا بیٹا اور ضرور نکلے گا۔

میری آنکھیں تجسس کے مارے اور کھل گئیں۔

وہ کیسے میرے پاس ایک ترکیب ہے۔

ترکیب! میں نے حیرت سے پوچھا۔

میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا اس لیے پوچھ بیٹا۔

پر ترکیب ہے کیا۔

ماسٹر جی اعتماد کے ساتھ بولے وقت آنے پر پتہ چل جائے گا' اتنا بول کر ماسٹر جی اپنے سینے میں غم کا طوفان لیے بوجھل قدموں سے رخصت ہوئے۔ ماسٹر جی کی پریشان حالت دیکھ کر میں دیر رات گئے تک سونہ سکا صرف ماسٹر جی کے بارے میں سوچتا رہا جس کے پاس سب کچھ ہو کے بھی کچھ بھی نہیں تھا۔

کچھ دنوں کے لیے مجھے دفتر کے کام کے سلسلے میں شہر سے باہر جانا پڑا' تقریباً مہینہ ڈیڑھ ماہ کے بعد جب میں واپس لوٹا تو اپنے گھر کی طرف جاتے وقت ماسٹر جی کے مکان کی طرف نظر گئی وہاں مجھے ان کے گھر کے پاس ہی خالی پڑی زمین پر کچی اینٹوں اور ٹین کی نئی چادروں سے بنا ایک چھوٹا سا گھر نظر آیا۔ میں یہ دیکھ کر حیراں ہوا اور ابھی اسی سوچ میں تھا کہ کسی سے پوچھوں کہ یہ نیا چھوٹا سا گھر کس کا ہے کہ ماسٹر جی اس گھر سے نکلتے ہوئے دکھائی دیئے اور ایک دم ان کی نگاہ مجھ پر پڑی تو لپک کر میرے قریب آئے اور مجھے گلے لگا کر کہا۔

دیکھو بیٹا میں انور کی ماں کے ساتھ واپس یہی رہنے کے لیے آ گیا اپنی بستی اور اپنے لوگوں کے بیچ۔

میں خوش بھی تھا اور حیراں بھی کہ ماسٹر جی ساتھ ہی بولے۔

پیڑ اپنی جڑوں سے کٹ کر باقی نہیں رہتا۔

☆☆☆

بھیانک روگ

کاش میں اسے پہچان پاتا اور میری الجھن سلجھ جاتی۔

انسان کی دیوہیکل بھیڑ رواں دواں تھی۔ سب اپنی اپنی رفتار میں اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر چل رہے تھے جیسے کسی بڑی مشین کے پُرزے ہوں۔ وہ اس تمام بھیڑ کا حصہ ہونے کے باوجود بھی الگ تھا۔ اس کے بڑھتے قدم تب چلتے چلتے رُک گئے جب اس کی نظر بازار کی ایک بند دکان کے شٹر پر چسپاں ایک اشتہار پر پڑی جس کے اوپر موٹے حروف میں لکھا تھا ''اطلاع گمشدگی''۔ ایک عام قسم کی لکھی ہوئی عبارت کے ساتھ اوپر ایک تصویر بھی چھپی ہوئی تھی عبارت کچھ یوں تھی۔

اشتہار میں چھپی تصویر ایک لاپتہ شخص کی ہے ہم پہلے ہی ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اخبارات کے ذریعے اطلاع دے چکے ہیں اور اب بذریعہ اشتہار بھی عوام کو مطلع کرتے ہیں کہ اگر کسی کو اس گمشدہ شخص کے بارے میں کوئی علمیت ہو تو برائے کرم نیچے دیئے ہوئے فون نمبرات پر رابطہ قائم کریں۔

نوٹ: پتہ دینے والے کو انعام دیا جائے گا۔

فون نمبرات نظر انداز کرتے ہوئے وہ یہ عبارت کئی بار پڑھ چکا تھا اور بار بار پھر پڑھے جا رہا تھا۔ اشتہار کی عبارت کئی بار پڑھنے کے بعد پھر تصویر کو گھورنے لگا اور اپنے ساتھ پھر سے بڑبڑانے لگا کاش میں اسے پہچان پاتا اور میری الجھن سلجھ

جاتی اور ساتھ ہی پھر سوچ کے گہرے ساگر میں ڈوب گیا۔ میں تو اس شخص کو اچھی طرح جانتا ہوں۔اس کا چہرہ کافی شناسا ہے ۔ پر یہ یادنہیں آرہا کہ کیسے جانتا ہوں۔ میں نے اسے کب اور کہاں دیکھا ہے۔ یا پھر صرف دیکھا ہے یا پھر اس سے مل بھی چکا ہوں۔ ویسے تو اب لوگوں نے عجیب سی عادت بنا ڈالی ہے جیسے یہ بھی کوئی فیشن ہو زیادہ تر وقت گھر سے باہر ہی گزارتے ہیں۔ یا پھر یہ بھی ہوسکتا ہے یہ شخص گھر واپس لوٹنا چاہتا ہو مگر کسی حادثے کا شکار ہوا ہو یا گندی سیاست کے ہتھے چڑا ہو۔ یہ بھی تو ممکن ہے کسی نے اسے اغوا کرلیا ہو یا پھر اس کی کسی کے ساتھ دشمنی ہو اور دشمنوں نے اس کا قتل کر دیا ہو۔ ویسے بھی ہمارے چاروں اطراف یہی سب کچھ تو ہو رہا ہے مار دھاڑ قتل وغارت' فریب' دھوکا دہی وغیرہ اور ایسے حالات میں کچھ بھی ممکن ہے موجودہ حالات میں زندگی بسر کرنا کسی چیلنج سے کم نہیں کچھ لوگ اس چیلنج کے سامنے ہار مان لیتے ہیں اور خودکشی کر لیتے ہیں۔ خودکشی سے یاد آیا ہوسکتا ہے اس نے بھی زندگی سے تنگ آ کر خودکشی کر لی ہو اور ابھی اس کے گھر والوں کو اس بات کا علم نہ ہو۔ یا پھر یہ بھی تو ممکن ہے کہ اس شخص نے ہمارے چاروں اور بدنظمی اور انسانی اقدار کی پامالی دیکھ کر زندگی کا دامن چھوڑ دیا ہو۔ نہیں نہیں یہ نہیں ہوسکتا۔ تیسری دنیا کا باشندہ ابھی اتنا سنجیدہ کہاں ہوا کہ سماج کی بدنظمی اور انسانی اقدار کی پامالی دیکھ کر خود کو بلی چڑھا دے۔ ابھی تیسری دنیا کا انسان بہت پیچھے ہے۔ وہ سوچ کی گہرایوں میں ڈوبتا رہا اور تصویر کو مبہوت ہو کر گھورتا رہا۔

کہاں.... کہاں دیکھا ہے میں نے اسے۔ نہ یہ میرا کوئی رشتہ دار ہے اور نا ہی کوئی دوست میری اس کے ساتھ کیسی شناسائی ہے۔ اس کا چہرہ اتنا مانوس سا کیوں لگتا ہے۔ مجھے کچھ یادنہیں آتا۔ میں اتنا بوڑھا تو نہیں جو میری یادداشت اتنی کمزور ہوگئی ہے۔ آج واقعی مجھے کام پر پہنچنے میں دیر ہو جائے گی اور مجھے اپنے باس کی بکواس سننی

پڑے گی۔

وہ ہر ایک چیز سے بے نیاز اپنے چاروں اطراف کی گہما گہمی سے بے خبر اشتہار میں چھپی تصویر کو پہچاننے کی کوشش میں تھا کہ اسے کوٹ کی آستین میں تھوڑا کھینچاؤ محسوس ہوا اور ایک پتلی سی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

کچھ پیسے دے دو بابو..... کچھ پیسے دے دو بابو۔

بہت بھوک لگی ہے کچھ پیسے دے دو نہ بابو۔

اُس نے پیچھے مُڑ کر دیکھا ایک سات آٹھ سال کی کالی دبلی پتلی بچی گندے ہاتھوں کو پھیلائے اُس سے پیسے مانگ رہی تھی۔ اس بچی کے پھٹے پرانے کپڑے الجھے بے ترتیب بال اور چہرے سے ٹپکتی بے بسی دیکھ کر اسے عجیب سا محسوس ہوا۔

پیسے..... بھوک..... پیسے چاہیے ٹھہرو ٹھہرو۔ دیکھتا ہوں۔

کوٹ کی جیب خالی، پتلون کی جیبیں خالی۔ ایک ایک کر کے سبھی جیبیں ٹٹولنے پر اُسے کوٹ کے اندرونی جیب میں کوئی چیز محسوس ہوئی۔ اس نے دیکھا نوٹوں سے بھرا ہوا بٹوا تھا۔ اُس نے پہلے تھوڑی دیر کے لیے ان نوٹوں کو اجنبی نظروں سے دیکھا جیسے اسے پتہ ہی نہیں تھا کہ اس کے پاس اتنے پیسے موجود ہیں۔ پھر تھوڑے وقفے کے بعد ایک سو روپے کا کرارا نوٹ نکالا اور بھیک مانگتی ہوئی بچی کو دیا۔ اس نے جب بٹوا واپس جیب میں رکھا تو جیب میں رکھنے سے ذرا قبل اس کی ایک ہلکی سی نظر بٹوے میں لگی تصویر پر گئی۔ وہ ٹھٹک گیا۔ اس کے پیروں تلے زمین کھسکنے لگی۔ اپنے گھٹنوں میں کمزوری محسوس ہونے لگی اور دل زوروں سے دھڑکنے لگا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے بٹوا واپس نکالا اور ڈرتے ڈرتے اسے کھولا۔ بٹوے میں ایک طرف لگی تصویر اور اشتہار میں چھپی تصویر ایک ہی شخص کی تھی۔

یہ..... یہ..... یہ کیسے ممکن ہے ۔نہیں ..... نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔ یہ دونوں تصویریں ایک ہی جیسی نہیں ہوسکتیں۔ ایک..... ایک دفعہ پھر دیکھتا ہوں۔ اس نے دونوں تصویروں پر یکے بعد دیگرے نظر دوڑائیں پر دونوں تصویریں ایک دوسرے کی کاپیاں تھیں۔ تو کیا یہ اشتہار میرے لیے ہے۔ نہیں نہیں یہ میری تصویر نہیں ہوسکتی۔ میں تو گم نہیں۔ میں تو لاپتہ نہیں۔ میں ہوں ہاں ہاں میں ہوں۔ ڈسکارٹس نے کہا تھا I think therefore I exit میں بھی سوچ رہا ہوں اور میرا سوچنا ہی میرے ہونے کا ثبوت ہے۔ میں بالکل گمشدہ نہیں۔ میں تو کام پر نکلا ہوں وہ سب میرا انتظار کررہے ہوں گے وہ ٹیبل بھی جس پر میں کام کرتا ہوں وہ فائیلیں بھی، ہری، نیلی، پیلی، سفید رنگ کی بے شمار فائیلیں اور وہ وال کلاک بھی جو میرے سامنے دیوار پر لگا ہے اور جس کی سوئی پتہ نہیں کب سے اٹکی ہوئی ہے۔ یہ سب میرا انتظار کررہے ہوں گے مجھے تو آگے بڑھنا ہوگا مجھے کام پر جانا ہوگا۔

پر یہ بٹوا!

یہ بٹوا میرا تو نہیں یہ تو اُس شخص کا ہے جس کے متعلق اشتہار چھپا ہے۔

تو کیا یہ میں نہیں۔ کاش مجھے اپنی صورت یاد آتی۔ پر مجھے اپنی صورت بھی یاد نہیں آرہی ہے۔ شاید میں نے بہت عرصے سے آئینہ نہیں دیکھا ایک نظر آئینہ دیکھوں تو ابھی اس دہشت سے نجات ملے پر اس بھاگ دوڑ بھرے شہر میں اب آئینہ کہاں سے لاؤں۔ اصل میں میری پریشانی میں اضافے کی وجہ یہ بٹوا ہے۔ اگر یہ بٹوا میرا نہیں تو میرے کوٹ کی جیب میں کیسے۔ مجھے کچھ یاد کیوں نہیں آرہا۔ میری یاداشت کا چشمہ کیوں سوکھ چکا ہے مجھے کوئی بات یاد کیوں نہیں آرہی۔ مجھے یہ بھی تو یاد نہیں کہ یہ کپڑے میں نے کب پہنے ہیں یہ کپڑے میرے ہیں بھی یا نہیں تو کیا یہ کسی

نے میری جیب میں ڈالا ہے۔ بھلا کوئی نوٹوں سے بھرا بٹوا کیوں میری جیب میں ڈالے گا۔ یا پھر ہوسکتا ہے کہ یہ کپڑے میرے نہ ہوں سب کچھ الجھا ہوا ہے۔ یہ سب ایک سازش بھی ہوسکتی ہے ایک گہری سازش۔ مجھے پھانسنے کی۔ میرے خلاف رچی ہوئی کوئی گہری سازش۔ تو یہ طے ہے کہ نہ یہ بٹوا میرا ہے اور نہ ہی میرے بدن پر یہ کپڑے میرے ہیں..... ہاں..... ہاں بالکل ایسا ہی ہے۔

اُس نے پہلے نوٹوں سے بھرا پرس ایسے گھبرا کر پھینک دیا جیسے اُس کے ہاتھوں میں کوئی رینگتا ہوا کیڑا آ گیا ہو۔

مجھے عجیب سی گھٹن محسوس ہو رہی ہے۔ مجھے اس گھٹن اس الجھن سے نجات .... یہ کپڑے میرے بدن پر ایک بوجھ ہے سراسر ایک بوجھ مجھے اس بوجھ سے خود کو آزاد کرنا ہی ہوگا۔

ہاں..... ہاں..... آزاد کرنا ہی ہوگا۔

کچھ وقفے کے بعد انسانوں کی دیوہیکل بھیڑ مشینی پرزوں کی طرح ہل رہی تھی اور وہ اس تمام بھیڑ میں برہنہ کھڑا تھا۔

☆☆☆

خواب کا باقی حصہ

خوشیوں کے پل کتنے مختصر اور بے معنی ہوتے ہیں۔

اس بات کا احساس مجھے ہو ہی گیا۔ کل شام تک میں کتنی خوش تھی پھر ساری خوشیوں کے آئینے میں حیرت اور پریشانی کا بال آ گیا۔ ارے میں نے تو اپنا تعارف کرایا ہی نہیں، میرا نام کاشفہ ہے مشہور رائٹر کمال صاحب کی بیٹی۔ اصل میں مجھے اپنا پورا نام کہنا چاہیے۔ ڈاکٹر کاشفہ کمال کیونکہ اب نام کے ساتھ پروفیشن اور ڈگریوں کے القاب ساتھ جوڑنا فیشن ہو گیا ہے۔ میری ایم، بی، بی، ایس کی ٹریننگ کل ہی ختم ہوگئی۔ یہ ٹریننگ میں نے گھر سے دور دوسرے شہر کے میڈیکل کالج میں مکمل کر لی۔ لگ بھگ چھ ماہ شروع کے ہوسٹل میں رہی لیکن جب اپنی بیچ میٹ ماحین کے ساتھ میری دوستی اور زیادہ گہری ہوئی تو وہ مجھے اپنے گھر لے آئی۔ پھر ہم دونوں اس کے گھر سے ہی اکٹھے کالج آتے رہے۔ ماحین کے گھر جانے سے میرا اکیلا پن بہت حد تک کم ہوا۔ ماحین کی ممی شہناز آنٹی اور اس کے پاپا شمیم انکل میرا کافی خیال رکھتے۔ خاص کر شہناز آنٹی تو اپنی بیٹی سے بھی زیادہ میرا خیال رکھتی۔

بہر حال میرا شوق اور محنت رنگ لائے کیونکہ میں ڈاکٹر بننا چاہتی تھی اور وہ میں بن گئی۔ آگے کا ارادہ ایم۔ ایس کرنے کا ہے۔ کیونکہ پاپا کہتے ہیں طب میں صرف جراحی کا علم ہی عملی علم کا ثبوت ہے باقی سارا طب قیاس پر مبنی ہے۔ حالانکہ پاپا

نے کبھی بھی مجھے کسی بات کو لے کر فورس نہیں کیا۔ میرا ماننا ہے میرے پاپا ورلڈ کے سب سے بیسٹ پاپا ہیں۔ میری تمام زندگی میں، میں اگر کسی سے متاثر ہوں تو وہ صرف انہیں سے ہوں۔ وہ میرے آئیڈیل ہیں۔ اس لیے نہیں کہ وہ بہت بڑے انٹلیکچول ہیں یا پھر مشہور رائٹر ہیں بلکہ اس لیے کہ میں نے ان میں ایک اچھے باپ کی تمام خصوصیات موجود پائیں۔ اگر دیکھا جائے تو مما اور ان کے مزاج میں آسمان زمین کا فرق ہے۔ مما کافی غصے والی اور چڑ چڑئی ہیں جب کہ پاپا ایک دم شانت سبھاؤ کے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ پاپا کی آنکھوں میں عجیب قسم کی گہرائی اور اداسی چھائی رہتی ہے۔ پر وہ کبھی کسی سے نہ کوئی شکایت کرتے ہیں اور نا ہی کبھی کسی کی برائی۔ ان کا زیادہ تر وقت اپنے سٹیڈی روم میں لکھنے پڑھنے میں گزرتا ہے۔

میں جب چھوٹی تھی تو میں سونے سے پہلے ہمیشہ پاپا سے ضد کر بیٹھتی کہ وہ مجھے کوئی کہانی سنائیں۔ پاپا مجھے روز ایک ہی کہانی سناتے تھے اور کہتے یہ کہانی نہیں بلکہ ایک خواب ہے جو انہوں نے کبھی دیکھا تھا۔ پاپا میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے اور کہتے:

سنو کاش! میں نے خواب میں ایک بہت بڑا باغ دیکھا۔ اس باغ میں بہت ہی خوب صورت اور خوشبودار پھول موجود ہیں۔ یاسمین، چمیلی، گلاب، گلِ آفتاب اور بہت سارے اقسام کے پھول، رنگ برنگے پیلے، سفید، سرخ اور دوسرے رنگوں کے پھول۔ اس باغ میں مجھے ایک بوڑھا مالی نظر آیا جو اپنے کام میں مصروف تھا۔ اس سارے باغ میں ان سارے پھولوں میں سے ایک بے حد حسین اور زیادہ مہک دار پھول موجود تھا۔ یہ پھول سارے باغ میں کچھ زیادہ نمایاں تھا اور تمام باغ کا مرکز بھی۔ جس کے اوپر ایک بھنورا منڈلا رہا تھا۔ وہ بھنورا اس پھول پر بالکل ہی فریفتہ تھا۔

پھول بھی اس بھنورے کو اپنی پلکوں پر بٹھائے ہوئے تھا۔ بوڑھا مالی ان کا پیار دیکھ کر بے حد خوش نظر آ رہا تھا۔ وہ انہیں دعائیں دے رہا تھا۔ان کی سلامتی اور خوش آئند مستقبل کی دعائیں۔ پھر باغ کے دروازے پر دستک ہوئی۔

ٹھک..... ٹھک..... ٹھک

یہاں تک خواب سنتے سنتے ہمیشہ میری آنکھ لگ گئی ہوتی۔ بہت دنوں تک بچپن میں میں نے پاپا کا یہی ایک خواب سنا۔ایک دن میں نے ارادہ کیا کہ آج میں پورا خواب سن کر ہی رہوں گی اور اگر میری پلکیں بوجھل ہو بھی گئیں تو میں خود کو جگاتی رہوں گی اور سارا خواب سن لوں گی اور میں نے اس پر عمل بھی کیا۔ جب پاپا خواب سناتے سناتے کہنے لگے۔ پھر باغ کے دروازے پر دستک ہوئی ٹھک..... ٹھک ..... ٹھک، یہ کہہ کر جب پاپا اٹھنے لگے تو میں نے انہیں آواز دی:

پاپا پھر کیا ہوا باغ کے دروازے پر کون تھا۔

پاپا پیچھے مڑے اور یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ میں ابھی تک جاگ رہی ہوں۔ وہ تھوڑے پریشان ہوئے اور کہا میں نے اتنا ہی خواب دیکھا ہے۔ پھر میری آنکھ کھل گئی۔ سمجھی..... یہ کہہ کر پاپا میرے کمرے سے ایسے باہر نکل آئے جیسے مجھ سے خفا ہو گئے ہوں۔اس رات کے بعد پاپا پھر کبھی بھی میرے کمرے میں نہ آئے اور نا ہی کبھی اپنا خواب سنایا۔میرے اندر اس ادھورے خواب نے گہرا اثر چھوڑا اور یہ ہمیشہ میرے ذہن و دل پر سوار رہا۔

یہ کل رات کی بات ہے، ہمارے کالج میں ٹریننگ مکمل ہونے پر ایک سلیبریشن پارٹی رکھی گئی۔ ماحین خود تو گئی مجھے بھی پارٹی میں شریک ہونے کے لیے اصرار کیا۔لیکن میں نے شہناز آنٹی اور شمیم انکل کے پاس ہی رکنا پسند کیا۔ میں ویسے

بھی گھر جانے کی خوشی سے چور تھی۔اپنی زندگی کا مقصد مکمل ہونے پر پُر مسرت تھی۔ ماحین کو پارٹی میں دیر ہوئی اور میں کمرے میں اکیلی تھی۔رات کافی ٹھنڈی تھی' تبھی شہناز آنٹی ایک الیکٹرک کمبل ہاتھ میں لیے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی۔

بیٹی کاش یہ الیکٹرک کمبل لے لو اس کی ضرورت پڑے گی۔

پھر وہی ہوا جس کا تجسس او راشتیاق مجھے بچپن سے تھا۔ پاپا کا سنایا ہوا ادھورا خواب یوں آگے بڑا۔ باغ کے دروازے پر دستک ہو رہی ہے۔

ٹھک..... ٹھک..... ٹھک

باغ کا دروازہ ایک بوڑھے مالی نے کھولا۔ مالی نے ایک شہزادے کو اپنے کارواں کے ہمراہ پایا اور اس نے شہزادے کو خوش آمدید کہا۔شہزادہ جب باغ میں داخل ہوا تو دیکھا کہ باغ بہت سارے خوبصورت پھولوں سے بھرا پڑا ہے لیکن اس کی آنکھیں کچھ اور ہی ڈھونڈ رہی تھیں۔اس نے اِدھر اُدھر بہت ڈھونڈا مالی بھی شہزادے کی یہ تلاش اور اضطرابی کیفیت دیکھ کر حیران ہوا۔ پھر شہزادے کی نظر ایک خوب صورت پھول پر پڑی جو پورے باغ کا مرکز تھا وہ بے حد خوش ہوا۔ وہ اس کو توڑنے ہی والا تھا کہ بوڑھا مالی گویا ہوا:

حضور! جان کی امان پاؤں اس پھول کو نہ توڑیں اگر ایسا ہوا تو یہ پھول مرجا تو جائے گا۔ پر یہ بھنورا بھی زندہ نہ رہ پائے گا۔

ارے بوڑھے مالی تم ہوش میں تو ہو بھلا مجھے کون روک سکتا ہے شہزادے نے جواب دیا اور اگر ان دونوں کا انجام یہی ہونا ہے تو ہونے دو۔ یہ سب طے شدہ ہے۔اس کتاب میں یہی لکھا ہے۔شہزادے نے بوڑھے مالی کو چمڑے میں لپٹی ایک کتاب دکھائی' شہزادے نے جونہی پھول کو توڑا بھنورا اس کے ارد گرد تیزی سے

منڈلانے لگا جیسے وہ منتیں کررہا ہو' ایسا نہ کرو' ایسا نہ کرو' مالی پریشان تھا۔ شہزادے نے گھوڑے پر چابک مارا اور پھول کو اڑا کر لے گیا مگر چمڑے میں لپٹی کتاب مالی کی اور پھینک دی اور یوں پھول اور بھنورے کو ہمیشہ کے لیے جدا کر گیا۔

کل رات میں جب پاپا کے سنائے ہوئے خواب کا باقی حصہ شہناز آنٹی کی زبان سے سن رہی تھی تو میں حیرانگی اور تذبذب کے پہاڑوں تلے دبی جا رہی تھی۔ پاپا کے دیکھے ہوئے خواب کا باقی حصہ شہناز آنٹی نے کیسے........ شہناز آنٹی کی آنکھیں کافی بھیگ گئیں..... اور ان میں نمکین پانی تیر رہا تھا۔ جب وہ جانے لگی تو نہ جانے کیسے؟..... میں نے جرأت کر کے پوچھ ہی لیا:

آنٹی وہ کتاب کون سی تھی۔

شہناز آنٹی میرے قریب آئیں' میرے ماتھے پر بوسہ دیا اور کہا بیٹی مالی نے جب چمڑے میں لپٹی ہوئی کتاب کھولی تو اس پر صاف لکھا تھا:

''تقدیر''

شہناز آنٹی اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کمرے سے جلدی جلدی باہر چلی آئیں۔

☆☆☆

گئے دنوں کا سراغ لے کر

خانقاہ کے گنبد سے کبوتروں کو پرواز بھرتے ہوئے بہت دنوں کے بعد دیکھا کیونکہ..... کیونکہ آج کرفیو میں نرمی ہے۔

یہ شہر بھی بند لفافے کی طرح پڑا رہا' کرفیو' ہڑتال اور بندشیں۔ زندگی انہی تین لفظوں پر آ کر ٹھہر کر رہ گئی اور میں بھی..... میں بھی یہاں اس کرفیو زدہ شہر میں آ کر پھنس گیا۔ اُف یہ مجبوریاں' اُف یہ محرومیاں..... جو انسان کے ساتھ سائے کی طرح چلتی رہتی ہیں اور دل ہے کہ ہمیشہ الجھنوں میں الجھا ہوا رہتا ہے۔ دل..... دل سے یاد آیا میرا دل بھی ایک کانفلکٹ (Conflict) زون ہے بالکل اس شہر کی طرح۔ پر میں اب اس شہر سے دور نکل جانا چاہتا ہوں اسی لیے تو یہاں اس سڑک پر کھڑا گاڑی کا انتظار کر رہا ہوں کیونکہ اس وقت کرفیو میں ایک گھنٹے کی نرمی ہے۔ لیکن نرمی کے باوجود کہیں سے کوئی گاڑی آتی ہوئی نظر نہیں آ رہی ہے اور نا ہی لوگوں کی نقل و حرکت ہی ہے۔ بس کبھی کبھار اِکا دُکا راہ گیر ہی نظر آ رہے ہیں۔ دوبارہ کرفیو لگنے سے پہلے مجھے یہاں سے نکلنا ہوگا۔ ہاں ہاں کسی بھی صورت۔ ویسے بھی اس شہر میں میرے لیے کچھ بھی نہیں رکھا ہے۔ جو کچھ تھا وہ سترہ سال پہلے لٹ چکا ہے۔ کہنے کو تو اپنا پشتنی مکان' بھائی' بہن' دوست' رشتہ دار سبھی ہیں لیکن..... نائلہ نہیں۔

نائلہ میری توجہ میرے خیالات، میرے وجود کا مرکز.....

اتنے برسوں بعد جیسے کسی نے یادوں کے ٹھہرے ہوئے پانی میں کنکر مار دیا ہو۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میں نے اسے اپنے چچازاد بھائی کے یہاں پہلی بار دیکھا تھا اور اسے دیکھتے ہی میں مبہوت ہو گیا تھا۔

ایک تیز رفتار گاڑی سامنے سے آندھی کی طرح گذر گئی۔

اُف مجھے اس سے لفٹ لینے کی بھی مہلت نہیں ملی۔ کہیں سے کوئی ٹیکسی بھی نظر نہیں آ رہی ہے۔ آہ! وہ سہ پہر اور شام کے درمیان کا وقت تھا جب پہلی بار میری نظریں نائلہ سے ملیں اور وہ پہلی ہی نظر میں میرے دل میں اتر گئی۔ بے حد خوبصورت تھی اسی لیے، شاید، مجھے پتہ نہیں کہ دنیا کی نظروں میں خوبصورتی کا کیا معیار ہے۔ شاید گورا چٹا ہونا، سنہرے بال یا پھر نیلی آنکھیں..... پر ان میں سے کوئی بھی چیز اس میں نہ تھی۔ وہ تو بالکل سانولی تھی۔ مجھے پہلی بار پتہ چلا کہ سانولے چہرے بھی خوب صورت ہوا کرتے ہیں۔ اسے کیا دیکھا کہ دنیا ہی بدل گئی پر وہ ایک دم سے اُڑن چھو ہو گئی اور میں اس کے بارے میں معلومات اکٹھی کرنے لگا۔ کہاں رہتی ہے؟ یہاں کیوں آئی تھی؟ نام کیا ہے؟ کام کیا کرتی ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

ٹیچر ہے۔

بھابی نے بتایا۔

کہاں؟

میں نے بے باک ہو کے پوچھا۔

کیوں پوچھ رہے ہو۔ بھابی نے سوال پر سوال کیا۔

بس ایسے ہی۔ میں نے اپنے آپ کو بچاتے ہوئے کہا۔
شہر کے وسط میں جو مشن سکول ہے وہیں پر۔ بھابی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

پھر کیا تھا۔ اگلے روز سے سکول کے چکر کاٹنے شروع کیے۔ وہ ٹیڑھی ترچھی نظروں سے دیکھتی اور مجھے وہاں پا کر خفا ہو جایا کرتی۔ ویسے بھی اس کے چہرے سے ہمیشہ غصہ ہی ٹپکتا رہتا تھا۔ مگر غصے میں وہ اور بھی زیادہ خوبصورت دِکھتی تھی۔

وہ ایک شخص میری طرف ہی آ رہا ہے۔

سنئے! کیا یہاں آگے کوئی دکان کھلی ہے۔ مجھے بچے کے لیے دودھ کا ڈبہ خریدنا تھا۔ جی معاف کیجئے میں تو کچھ دیر سے یہیں پر کھڑا ہوں معلوم نہیں ہو سکتا ہے آگے بازار میں یا کسی گلی کوچے میں کوئی دکان کھلی ہو۔

کیا مجھے یہاں خود رکنا چاہیے یا پھر آگے چلنا چاہیے میں سوچنے لگا۔
نہیں..... نہیں آگے کا کچھ پتہ نہیں کہ کیسے حالات ہوں گے۔

یہیں پر ٹھہرنا مناسب ہے۔ اس بڑی بی کو بھی انہیں دنوں مرنا تھا۔ وہ نہ مرتی تو میں یہاں کیوں چلا آتا۔ خیر اللہ بڑی بی کو جنت نصیب کرے۔ مجھے اس کے مرنے پر تعزیت پرسی کے لیے یہاں تو آنا ہی تھا۔ ہر بات میں خود غرضی اچھی نہیں ہوتی۔ میں سب سے جھوٹ کہہ سکتا ہوں مگر خود سے نہیں۔ میرے اندر یہ خواہش ضرور چھُپی تھی کہ یہاں نائلہ بھی ضرور ہو گی۔

کھڑے کھڑے پسینے سے شرابور ہو گیا ہوں۔

رومال نکال کر پسینہ پونچھتا ہوں۔

غصہ، ہر بات پر غصہ۔ جب ایک روز ایک قریبی رشتہ دار کی شادی کی تقریب میں، میں نے اپنے دل کی بات اُس کے سامنے رکھی تو وہ ایک دم غصہ ہوگئی۔

''آئینے میں اپنی شکل دیکھی ہے'' تمہاری اوقات کیا ہے۔ایک معمولی سے سرکاری نوکر۔ میں ایسے ہی ایں ویں ہی.....اپنا گھر دیکھا ہے۔دو کمروں کا جھولا جسے تم آشیانہ کہتے ہو۔کیا وہاں پر رکھو گے مجھے۔ ہرگز نہیں۔

اور میں مایوس واپس لوٹ آیا۔دل ٹوٹ جائے تو اس کی کرچیاں اندر اندر ہی چبھنے لگتی ہیں۔

ایک شخص تیزی سے میری طرف بڑھا اور پاس آتے ہی پوچھنے لگا۔ ماچس۔آپ کے پاس ماچس ہوگی۔سگریٹ جلانی تھی۔ وہ سگریٹ سلگا کر چلنے لگا۔ایک دو قدم چلتے ہی پیچھے مڑا اور مجھ سے پوچھنے لگا۔آپ یہاں پر کیا کر رہے ہیں۔جایئے واپس چلے جایئے۔

نہیں بھئی مجھے ریلوے اسٹیشن بس سٹینڈ، یا پھر آئر پورٹ..... کہیں پہنچنا ہے۔

ناممکن!

یہاں حالات اتنے خراب ہیں، یہ ناممکن ہے۔

خیر دیکھتا ہوں۔ میں نے جواب میں کہا۔حالات واقعی بہت خراب ہیں۔آہ ان خراب حالات میں بھی پتہ نہیں کیسے میں پرانی یادوں کے بھنور میں پھنستا چلا جا رہا ہوں۔میری جگہ کوئی اور ہوتا تو اپنی جان بچانے کے چکر میں یا پھر خوف و دہشت سے بھاگتا پھرتا۔ پر میں ہوں کہ پرانے زخموں کو کریدنے لگا ہوں۔میری عادت بھی بڑی عجیب ہے۔واہ ری بے بسی۔ نائلہ کے رویے سے دل تو ٹوٹ گیا لیکن اس بات کی بھی

تڑپ ضرور پیدا ہوئی کہ آخر اس نے میرا ہاتھ تھامنے سے انکار کیوں کیا۔ پھر اس کی سہیلی سے جا کر پتہ چلا نائلہ نے خود اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ وہ کسی شہزادے سے بیاہ رچائے گی جو اسے رانی کی طرح رکھے گا۔ کسی مالدار عاشق کی معشوقہ بن کر رہے نہ کہ مجھ جیسے فٹیچر کی۔

ایک بوڑھی عورت پاگلوں کی طرح چلی آئی اور پوچھنے لگی۔

بیٹا کیا یہاں کہیں دوائی مل سکتی ہے۔ اس نے اپنے ہاتھ میں رکھے نسخے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

معاف کیجئے ماں جی مجھے معلوم نہیں آگے جا کر پتہ کریں۔

چلو میں بھی سگریٹ سلگا لیتا ہوں۔

پرانی یادیں اور پرانے زخم ایک جیسے ہوتے ہیں۔ چند روز قبل بڑی بی کے گذر جانے پر ماتم داروں کے بیچ جب کئی برسوں کے بعد نائلہ کو دیکھا تو..... لگا اُس کا فیصلہ..... اُس کا فیصلہ بالکل.....

وہ گاڑی آرہی ہے۔ مجھے اس سے لفٹ لینی چاہیے ہاں ہاں بالکل۔

روکو..... ہیلو بھائی..... ارے..... سنو تو..... اُف یہ بھی چلا گیا۔

ہاں اتنے برسوں کے بعد نائلہ کو دیکھا تو لگا اس کا فیصلہ پتہ نہیں ٹھیک تھا یا غلط ہاں البتہ وہ بہت تھکی تھکی سی لگی اور اپنی عمر سے کافی بڑی بھی۔ چہرہ اترا ہوا ایک روتا بلکتا ہوا بچہ اس کا فرن تھامے اور دوسرا بسورتا ہوا اس کی گود میں..... بالکل ایک مرجھایا ہوا سا پھول۔

کیا دیکھ رہے ہیں۔

کچھ نہیں میں تو آپ کو پہچان ہی نہیں پایا۔ بالکل بدل گئی ہیں آپ

انبلیو ایبل میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

کیا اتنا بدل گئی ہوں۔

ہاں! آپ تو مرجھا سی گئی ہیں۔

پھول ہی مُرجھایا کرتے ہیں۔

اس نے ہمیشہ کی طرح ایک جملہ کہہ کر مجھے لاجواب کر دیا۔ واقعی پھول ہی مرجھایا کرتے ہیں۔ پر یہ مرجھایا ہوا چہرہ' یہ اڑی اڑی سی رنگت ان خوابوں کی تعبیر تو نہیں ہوسکتی جو کبھی اس نے دیکھے تھے۔

کہیں میری آنکھوں میں نمی تو نہیں۔نہیں..... نہیں میں اتنا کمزور نہیں۔

ارے یہ لوگ کہاں چلا گئے۔اب تو کہیں سے بھی کوئی نظر نہیں آ رہا ہے۔ صرف گشت پر معمور حفاظتی دستوں کی گاڑیاں نظر آ رہی ہیں۔

یہ شور کیسا ہے..... کیسا ہے..... یہ شور..... اُف..... شاید میرے اندر غموں کا بے حد شور ہے۔ مجھے کچھ سنائی نہیں دیتا۔گشت پر معمور گاڑی سے کچھ اونچی اونچی آواز آ رہی ہے ۔لیکن مجھے کچھ صاف سنائی نہیں دے رہا ہے۔

مجھے اپنی حالت پر قابو پانا چاہیے۔ پر یہ کیسے ممکن ہے۔

ہاں۔

بٹوے میں نائلہ کی تصویر ہے ایک نظر دیکھ لوں تو شاید طبیعت.....

بٹوا تو جیب میں نہیں ہے' دوسری' تیسری سبھی جیبیں خالی ہیں..... کہیں گر تو نہیں گیا' ہائے میں کتنا بھلکڑ ہوں۔ وہ تو میں نے بیگ میں رکھا ہے۔جو میرے کاندھے سے لٹکا ہوا ہے ۔ایک منٹ..... بیگ نیچے رکھتا ہوں اور بٹوا

ڈھونڈ لیتا ہوں۔

گشت پر معمور گاڑی سے لگا تار اس کا تعاقب ہو رہا تھا۔ تھوڑے وقفے کے بعد گشتی گاڑی میں بیٹھے سپاہیوں میں سے ایک سپاہی اپنی بندوق کی نلی کو پھونک مارتے ہوئے اس کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کیونکہ اس کی بندوق کی نلی سے ابھی بھی دھواں اٹھ رہا تھا۔ اس نے کرفیو کی خلاف ورزی کرنے والے یا پھر امکانی حملہ آور کو بھون ڈالا تھا۔

☆☆☆

نیا آدمی

(1)

(IN SEARCH OF BETTER WORLD)

''میں اب کافی تھک چکی ہوں ہار چکی ہوں''۔

''ہر لمحہ پریشان اور گھبرائے ہوئے رہنا اب میرا مقدر بن چکا ہے''۔

''ان کی حرکتیں مجھے ہر دن حیرت میں ڈال دیتی ہیں''۔

کسم دیوی اپنے بھائی سے اپنے شوہر سیوک کمار کی شکایت کر رہی تھی اور اُس کی آواز رُندھی ہوئی تھی۔سیوک کمار ہسپتال کے بیڈ پر کئی روز کی بے آرامی کے بعد اب نیند کا انجکشن لگوا کر سویا پڑا تھا۔کسم دیوی اور اُس کا بھائی سیوک کمار کے سرہانے بیٹھے تھے اور کسم دیوی آہستہ آہستہ اپنے بھائی سے کہہ رہی تھی۔

''تقدیر کے فیصلوں کے سامنے ہم سب بے بس ہیں اب دیکھو میرے پاس سب کچھ ہو کے بھی لگتا ہے کچھ بھی نہیں ہے۔ان کی حرکتوں سے پریشان رہتی ہوں۔روز دفتر سے جب لوٹتے ہیں تو اِن کی حالت نہایت بُری ہوتی ہے۔کپڑے اتنے گندے اور میلے ہوتے ہیں جیسے کوئلے کی کان سے مزدوری کر کے واپس لوٹے ہوں''۔

پھر پتہ چلا ہر روز بس میں اپنی سیٹ کسی بڑے بزرگ یا پھر کسی عورت کو بیٹھنے کے لیے ...... اور خود بھیڑ میں دھکے کھاتے رہتے ہیں۔کپڑوں کی حالت دھول دھبوں سے خراب تو ہونی ہی تھی پھر میں نے پوچھا آپ اس طرح اور لوڈ میں

کیوں سفر کرتے ہیں تو میری بات کو ان سُنا کر دیا' پھر میں نے اپنی قسم دلائی آئندہ ایسا نہ کیا کریں اور یہ مان بھی گئے لیکن اگلے روز کیا دیکھتی ہوں کہ ان کے کپڑوں کی حالت پہلے سے بھی زیادہ خراب تھی۔ میں نے پوچھا تو ٹال دیا پھر بعد میں اپنی پڑوسن سے پتہ چلا کہ وہ بازار میں کسی ٹھیلے (ریڈا) والے کی مدد کر رہے تھے اور بھرے بازار میں ٹھیلے کو دھکا دے رہے تھے جب پڑوسن نے ان سے پوچھا بھائی صاحب آپ یہ کیا کر رہے ہیں تو انہوں نے جواب دیا۔

''اس بے چارے سے اس ٹھیلے کو دھکا نہیں لگ رہا تھا سوچا اس کی تھوڑی سی مدد کر دوں''۔

ایک دن میں نے کہا چند مزدور لے آیئے مکان کی تھوڑی سی مرمت اور صفائی وغیرہ کرنا ہے تو کہنے لگے۔

''کوئی ضرورت نہیں''

''جب میں نے پوچھا وہ کیوں؟'' تو جواب میں کہنے لگے:

''یہ مزدوروں کا دیش ہے اور مزدوروں کو یہ شیوہ نہیں دیتا کہ وہ اپنا کام کرانے کے لیے مزدور رکھیں''۔

میں بالکل نہیں سمجھی اسی لیے میں نے کہا۔

''آپ کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں''۔

''دیکھو کسم جب تم یہ باتیں نہیں سمجھتی تو پھر بھلا بحث کرنے سے کیا فائدہ''۔ ان کا جواب سن کر میں چڑ گئی۔

''کیوں؟ کیوں نہیں سمجھوں گی کیا پڑھے لکھے صرف آپ ہی ہیں ہاں ہاں میں تو جاہل ہوں' گنوار ہوں''۔

''وہ بات نہیں ہے دیکھو سمجھنے کی کوشش کرو ہمارے دیش میں منتری سے لے کر چھوٹے کرمچاری تک سب ہی مزدور ہیں۔ کسی کو کسی سے کوئی سبقت نہیں۔ اصل میں ہم سب برابر ہیں۔اسی لیے مکان کی مرمت کرانے کے لیے مزدور لانے کی ضرورت بالکل نہیں میں اور تم یہ ضروری مرمت اور صفائی کا کام کرلیں گے''۔

ان کی حرکتیں، باتیں اور اصول بچوں کے لیے بھی پریشانی کا سبب بننے لگے ہیں۔انہوں نے اب بچوں کو ٹیلی ویژن دیکھنے پر پابندی لگا دی۔خاص کر فلم اور فلمی گانے دیکھنے پر، جب میں نے پوچھا تو کہنے لگے۔

ہر فلم یا ہر فلمی گیت یا نغمہ ہمیں Morally گائیڈ کرتا ہے۔ان چیزوں کا اثر ہم اور ہمارا دماغ بالواسطہ یا بلا واسطہ لے ہی لیتا ہے۔بہت احتمال ہے کہ بچے بگڑ جائیں گے کیونکہ اب زیادہ تر فلموں میں گنڈہ گردی، بھائی گری، مار دھاڑ اور فحاشی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔اکثر نغموں اور گیتوں کی حالت اس سے بھی بری ہے۔''گیت نہ ہوئے گالی گلوچ ہوا۔کیا بچے یہ سب سیکھیں گے''۔

میں نے تیش میں آ کر کہا''اس میں فلم والوں کا کیا قصور۔ یہ تو وہی سب کچھ دکھا رہے ہیں جو ہمارے آس پاس ہو رہا ہے''۔ یہ بھی کہاں ماننے والے تھے اٹھے اور اعلان کرتے ہوئے کہا۔

''آج سے کوئی ٹیلی ویژن نہیں دیکھے گا مجھے اور بحث نہیں کرنی''۔

گڈی کا ایڈمیشن ایک نئے بڑے اسکول میں کرانا تھا۔ پرانا اسکول بھی ٹھیک تھا لیکن میری خواہش تھی کہ وہ ایک بڑے شاندار اسکول میں پڑھے۔میں ایڈمیشن فارم لے آئی اور ان سے دفتر میں چھٹی رکھنے کو کہا تاکہ یہ خود فارم جمع کرانے جائیں۔تین دن تک لگاتار آفس میں چھٹی رکھی روز اسکول جاتے لیکن شام کو فارم جمع

کیے بغیر واپس لوٹ آتے۔ میں نے پوچھا ''آخر وجہ کیا ہے؟''۔ تو کہنے لگے۔

''وہاں لمبی لمبی قطاریں ہوتیں ہیں میری بھاری آنے سے پہلے ہی کاؤنٹر بند ہوجاتا ہے''۔

میں نے کہا ''جب اوروں کے فارم جمع ہوتے ہیں تو ہمارا کیوں نہیں''۔

تو انہوں نے پھر بات کو اَن سُنا کر دیا۔ آخر کار گڈی کا ایڈمیشن فارم جمع نہ کر پائے پتہ لگانے پر معلوم ہوا اصل وجہ یہ تھی کہ یہ قطار میں ہر نئے جڑنے والے شخص کو آگے کھڑا کر دیتے اور خود ان کے پیچھے کھڑے رہتے اور سہ پہر ہونے تک جب آخر کار یہ کاؤنٹر کے نزدیک پہنچ جاتے تو کاؤنٹر بند ہوجاتا۔ پھر میں نے بڑی مشکل سے اپنی سہیلی کی مدد لے کر سفارش کرا کے فارم جمع کرایا اور یوں گڈی کا ایڈمیشن کرالیا۔

تقریباً دو تین مہینے پہلے انہیں معدے کے درد کی کافی شکایت رہی میں نے ڈاکٹر کے پاس جانے کے لیے کہا مگر ٹالتے رہے۔ پھر جب تکلیف بڑھتی گئی تو میں ضد کر کے انہیں ڈاکٹر کے پاس لے گئی۔ ڈاکٹر نے کہا یہ سب تکلیف کھانا نہ کھانے کی وجہ سے ہوئی ہے۔ ڈاکٹر نے ان کا کام دھندا پوچھا اور پھر کہا کہ شاید انہوں نے کافی عرصے سے دوپہر کا کھانا نہیں کھایا ہے۔

میں نے حیرت کا اظہار کیا اور اپنی صفائی میں ڈاکٹر سے کہا ''میں تو روز انہیں کھانے کا ٹفن ساتھ دیتی ہوں۔ پھر کیسے.....''

پھر میں نے اِن کے آفس کے ساتھی شرما جی سے دریافت کرایا تو انہوں نے کہا ''سیوک کمار جی روز اپنا خالی ٹفن آفس لاتے ہیں یہ تو روز راستے میں ہی کسی بھوکے، ننگے بچے کو اپنے ٹفن کا کھانا کھلا دیتے ہیں''۔

ایک مہینہ ہمیں بہت ہی مشکلات میں گزارنا پڑا۔ پہلی تاریخ کو جب یہ اپنی

تنخواہ لے کر گھر لوٹ رہے تھے تو راستے میں انہیں ایک بوڑھا بھکاری ملا۔ اُس نے اپنے غموں کی داستان سُنا دی۔ پھر کیا تھا۔ انہوں نے بھی اپنی تنخواہ ساری کی ساری اُس کی ہتھیلی پر رکھ دی یہ بھی نہیں سوچا کہ پورا مہینہ ہم کیسے گزاریں گے۔ بچوں کے اسکول کی فیس اور دیگر ضروریات کہاں سے پوری ہوں گی۔ ان کی اس حرکت پر میں ان کے روبرو کھڑی ہوئی اور تنگ آ کر پوچھا۔

''آخر آپ وہی کرتے ہیں جو آپ کا جی چاہتا ہے۔ تھوڑے سے پیسے بچا کے رکھے ہوتے تو میں اس سے زہر خرید لیتی خود کھاتی اور بچوں کو بھی کھلا دیتی۔ کیوں؟ آخر کیوں کرتے ہیں آپ ایسا جس سے ہماری تکلیفیں کم ہونے کے بجائے بڑھ جاتیں''۔ تب انہوں نے بہت زیادہ سنجیدہ ہو کر میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا اور مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''کسم یہ دنیا اب رہنے کے لائق نہیں رہی ہے۔ اب کوئی اوتار اس دنیا کو سدھارنے کے لیے نہیں آئے گا۔ ہمیں ہی اس کو رہنے کے لائق بنانا پڑے گا۔ اپنے لیے، اپنوں کے لیے، آنے والی نسلوں کے لیے، ان کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے''۔

پھر چند روز قبل انہوں نے آفس کے ایک ساتھی کا کام اُس کے بدلے خود کرنے کا ذمہ لیا۔ کام نپٹانے میں کافی دیر ہوئی اور دیر رات گئے جب یہ آفس سے واپس لوٹ رہے تھے تو انہوں نے دیکھا کہ ایک نکڑ پر چند بدمعاش ایک لڑکی کے ساتھ زبردستی کر رہے تھے یہ اوروں کی طرح نظریں جھکا کر گذرنے والے کہاں تھے۔ یہ ان بدمعاشوں کے ساتھ بڑھ گئے یہ اس لڑکی کو بدمعاشوں کے چنگل سے بچانے میں کامیاب تو ہوئے لیکن ان ظالموں نے انہیں کافی مارا پیٹا اور ان پر چھری چاقو سے بھی وار کیا۔ نتیجہ یہ کافی زخمی ہوئے اور لہولہان ہو کر سڑک پر پڑے رہے۔ پھر

پتہ نہیں کن لوگوں نے انہیں ہسپتال پہنچایا اور مجھے خبر کر دی۔ کسم دیوی رونے لگی اور اس کا بھائی خاموشی سے یہ باتیں سن رہا تھا۔ کسم دیوی نے کہا کچھ ہی لوگ جو انہیں قریب سے جانتے ہیں انہیں اچھا سمجھتے ہیں۔ ورنہ زیادہ تر لوگ انہیں بے وقوف سمجھتے ہیں۔ تبھی سیوک کمار نیند سے جاگے اور کسم دیوی نے اپنے آنسو پونچھے۔ کسم دیوی کے بھائی نے سیوک کمار کی اور مسکرا کر دیکھا اور ان کی خیریت پوچھی تو سیوک کمار نے کہا۔

''ٹھیک ہی ہوں بس تھوڑی سی کمزوری ابھی بھی محسوس ہو رہی ہے''۔

''آپ آرام کیجئے میں اور کسم آپ کے لیے لنچ لے آتے ہیں''۔

جب کسم اور اُس کا بھائی تھوڑی دیر بعد لنچ لے کر واپس لوٹے تو دیکھا سیوک کمار اپنے بیڈ پر موجود نہ تھے بلکہ وہاں اُس کے بیڈ پر ایک بیمار بڑھیا سو رہی تھی دونوں نے ڈھونڈا تو دیکھا سیوک کمار وارڈ کے باہر کورِڈور (Corridore) میں دور ایک جگہ اور مریضوں کے ساتھ پڑے تھے، دونوں اس کی طرف لپکے اور اُس سے پوچھا۔

''وہ ..... بڑھیا آپ کے بیڈ پر کیسے سوئی ہے اور آپ یہاں کیسے'' تو سیوک کمار نے کہا۔

''مجھے پتہ ہے وہ بیڈ کیسے حاصل کیا گیا تھا۔ میں جانتا ہوں کسم نے وارڈ بوائے کو پیسے دے کر اُس بیڈ کا انتظام کیا تھا ورنہ اس ہسپتال میں مریض کو ایڈمٹ کرانے میں کتنی دشواریاں ہوتی ہیں۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ شاید وہ بیڈ میرے لیے ٹھیک نہیں تھا۔ میں وہ کانٹوں کا بستر چھوڑ کر یہاں چلا آیا۔ اس فرش پر یہاں قدرے سکون ہے، آرام ہے''۔

کسم دیوی نے لنچ کاٹفن اور بریڈ سیوک کمار کے سامنے رکھ دی۔ کسم اور اس کا بھائی ایک دوسرے کا منہ تکتے رہ گئے۔ تھوڑی دیر بعد کسم دیوی کے بھائی نے اپنی بہن کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

''سیوک کمار ہم میں سے تو ہے لیکن ہم جیسے نہیں یہ تو بالکل نیا آدمی ہے۔ ایک الگ ماٹی سے بنا نیا آدمی۔ تم اس آدمی کو اپنے آکار میں ڈھالنے کی غلطی کبھی نہیں کرنا ورنہ یہ ٹوٹ جائے گا، بکھر جائے گا۔ سیوک کا زندگی گذارنے کا یہ اپنا ایک طریقہ، ایک الگ فارمولا ہے۔ یہ طریقہ، یہ فارمولا ہماری سمجھ سے باہر ہے''۔

دونوں بھائی بہن سیوک کمار کو حیرت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

کیونکہ سیوک کمار بریڈ کے ٹکڑے سوپ میں ڈبا ڈبا کر ساتھ ہی پڑے ایک بزرگ مریض کو اپنے ہاتھوں سے کھلا رہا تھا۔

☆☆☆

دُھند کے مسافر

(مظفر نگر فسادات کے متاثرین کے نام)

یہ ملک کتنی بار تقسیم ہوگا۔
کتنی بار اس ملک کا بٹوارہ ہوگا۔
پھر دلوں کی زمین پر نفرت کی لکیروں سے سرحدیں کھینچی گئیں۔
پھر انسان کو انسان سے دور کردیا گیا۔

قمرالدین آگ کے الاؤ کے سامنے آگ تاپتے ہوئے کچھ ایسے ہی سوالوں میں گم تھا اور خود ہی ان سوالوں کے جواب ڈھونڈنے کی کوشش کررہا تھا۔ قمرالدین کے علاوہ اور چار لوگ بھی الاؤ کے سامنے بیٹھے تھے۔ وہ بھی اپنی اپنی سوچوں میں گُم تھے۔ گزرے وقت کی مصیبت بھری داستان ان کے چہروں پر بھی رقم تھی۔ چاروں اور دھند فقط دُھند پھیلی ہوئی تھی۔ مظفرنگر کے شمالی علاقے کے بڑے سے میدان میں، جہاں یہ لوگ ٹینٹوں میں رہنے کے لیے مجبور تھے، دُھند پھیلی ہوئی تھی اور اِسی دُھند میں ان لوگوں کی زندگی کا سفر جاری تھا۔

قمرالدین اُس کی بیوی، بیوہ بہو اور اُس کی سات سال کی چھوٹی پوتی نمو بھی انہی ٹینٹوں میں سے ایک ٹینٹ میں رہتے تھے۔ قمرالدین کا جوان بیٹا کچھ مہینے پہلے ہوئے فسادات میں ہلاک ہوگیا اور دیگر لوگوں کی طرح اُن کا گھر بھی فسادات میں

جل گیا۔ پر مصیبتیں تھمنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ قمرالدین کی بیوہ بہو دور ایک ہینڈ پمپ سے پانی کی بالٹیاں لالا کے دہری ہو جاتی۔ کڑا کے کی سردی میں اِن ٹینٹوں میں بے آسرا زندگی گزارنا مشکل تھا۔ رات کو سوتے وقت سردی سے بچنے کے لیے کمبل بھی پورے نہیں پڑ رہے تھے۔ رات کو نمو سردی سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ وہ اپنے دادا قمرالدین سے کہنے لگی۔

دادو نیند کیوں نہیں آ رہی ہے۔

سردی سے بیٹی۔

نیند نہ آنے کے سبب قمرالدین اور نمو باتیں کرنے لگے۔

دادو! میں آپ کو اپنی کتاب دکھاؤں۔ بہت اچھی کتاب ہے۔ اس پر رنگ برنگی تصویریں ہیں۔

کتاب!

کون سی کتاب؟

وہی جو میں وہیں سے لائی ہوں جہاں ہم پہلے رہتے تھے۔ وہیں ایک جگہ پڑی ہوئی ملی تھی۔

نہیں نہیں ابھی سونے کی کوشش کرو، سردی بہت ہے۔

پھر وہی سردی، جو قمرالدین اور اُس کے پریوار کو ستا رہی تھی، نیند کے سامنے ہار گئی۔ پتہ نہیں کب ان کی آنکھ لگ گئی۔

صبح آگ کے الاؤ کے سامنے قمرالدین سوچ رہا تھا کہ اِس آگ کو اپنے اندر جذب کرلوں۔ پھٹی پرانی ٹوپی، برائے نام کی چادر، سر سے گلے تک ایک نہایت میلا مفلر، جس سے اُس نے اپنے کان، گلا اور ٹوپی سمیت سر ڈھک لیا تھا، اس

کے بدن کا کل لباس تھا۔ آنکھوں پر ایک براؤن کلر کی عینک جس کے ایک شیشے میں شگاف پڑ گئے تھے۔ بالکل اُسی طرح جس طرح اُس کے جوان بیٹے کے مرنے سے اُس کے دل میں شگاف پڑ گئے تھے۔ ہاتھوں کو بار بار الاؤ کے نزدیک کرتا اور گرمی کا احساس اُسے اطمینان بخشتا۔

آگ.....

آگ..... اِس آگ کو اپنے اندر جذب کرلوں مگر.....

مگر ایک آگ پہلے ہی میرے اندر بھی جل رہی ہے۔ جو ہاشم کے مرنے کے بعد میرے اندر لگی ہے۔ پھر کچھ دیر تک ہاشم کو یاد کرنے لگا اور من ہی من خود کو تسلی دینے لگا۔ مصیبت اور عذاب بھری زندگی سے موت بہتر.....

پھر قمرالدین کو رات کی کڑاکے کی سردی یاد آئی اور اپنی محرومیاں بھی جس کی وجہ سے نمو سو نہ سکی۔

کاش! ایک اور کمبل کا انتظام ہو جاتا۔

دادو، دادو نمو کتاب ہاتھ میں لیے دوڑتی ہوئی آئی اور اپنے دادا سے کہنے لگی۔

دادو آپ یہ کتاب دیکھئے نا!

نہیں نہیں جا تو کھیل۔

پھر نمو گئی اور کھیلنے لگی۔ میدان میں اِدھر اُدھر بکھری پڑی چند اینٹوں اور اُن کے ایک آدھ ٹکڑے کو جمع کر کے انہیں ایک دوسرے کے اوپر رکھنے کی کوشش کرنے لگی۔ اینٹیں ایک دوسرے کے اوپر رکھ کر انہیں گھورنے لگتی اور خوش ہو جاتی۔

یہ کیا کر رہی ہو؟

اپنا نیا گھر بنا رہی ہوں۔

قمر الدین نمو کی آنکھوں سے جھانک رہے خواب کو اچھی طرح دیکھ رہا تھا اور سمجھ رہا تھا۔

پھر سرد ہوا کا جھونکا چلا۔

رات.....

سردی.....

کمبل.....

قمر الدین اٹھا اور چلنے لگا۔قدم اپنی منزل کو خوب پہچانتے تھے۔راستے میں آوارہ لڑکے اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔سگریٹ او ربیڑیاں پھونکتے اور مٹر گشتی کرتے۔

اِن کا مستقبل بھی اسی دُھند میں کہیں کھو گیا ہے۔سو گیا ہے ۔قمر الدین سوچنے لگا۔بیچارے کریں گے بھی کیا۔ان کے نصیب میں بھی دُھند ہی دُھند ہے۔ جس میں کچھ بھی صاف دکھائی نہیں دیتا۔قمر الدین برابر چلتا رہا۔

ریلیف کیمپ نمبر:۔ا

ناجی اب یہاں کوئی ریلیف کا سامان نہیں ہے۔سب ختم ہو گیا۔اب تو ہم یہ کیمپ بند کر رہے ہیں۔

خالی ریلیف کیمپ کے ایک ملازم نے سرد مہری سے جواب دیا۔

ریلیف کیمپ نمبر:۔۲

وہاں پہنچتے ہی پیچھے سے آواز آئی۔

کاکا یہ کیمپ تو پہلے سے ہی بند ہے۔

ریلیف کیمپ نمبر:۔۳

اس ریلیف کیمپ کا بورڈ ایک طرف سے اُکھڑ کر الٹا لٹک رہا تھا اور چیخ چیخ کر اپنے اوپر لکھی عبارت کو جھٹلا رہا تھا۔

قمرالدین کو پھر سردی کا خوف ستانے لگا اور اس کی آنکھوں کے سامنے نمو کا چہرہ گھوم گیا۔ وہ یوں ہی سوچتا رہا کہ پھر اچانک آواز آئی۔

آ گیا رے۔

ارے آ گیا رے۔

اس آواز نے قمرالدین اور آس پاس کے ماحول کو جیسے نیند سے جگا دیا۔

ارے وہ دیکھو آ گیا۔

پھر عجیب قسم کی بھاگم بھاگ ہونے لگی۔ لوگ دوڑنے بھاگنے لگے اور ان دو ٹرکوں کی اور پہنچنے کی کوشش کرنے لگے جو ابھی ابھی اس علاقے میں پہنچی تھیں۔ لوگ اُن ٹرکوں پر ٹوٹ پڑے۔ قمرالدین پہلے کچھ سمجھ ہی نہیں پایا۔ پھر کچھ دیر کے بعد خود ہی سمجھ گیا اور وہ بھی اور لوگوں کی طرح ایک ٹرک کے سامنے جمع بھیڑ میں آگے بڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ ان دونوں ٹرکوں میں پرانے استعمال شدہ گرم ملبوسات اور کمبلیں تھیں، جو کسی رضا کار تنظیم نے ان مصیبت زدہ لوگوں کے لیے بھیجی تھیں پر یہ سب لوگ آپس میں لڑ جھگڑ کر ان ملبوسات کو حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ آپس میں ہاتھا پائی اور گالی گلوچ بھی ہونے لگی۔

میں..... مجھے بھی..... او ہو..... ارے ذرا..... دیکھو..... جگہ چھوڑو....

آخر کار قمرالدین ٹرک کے بالکل نزدیک پہنچ گیا لوگ دو دو ہاتھوں سے یہ

پرانے استعمال شدہ کپڑے اٹھا رہے تھے۔قمر الدین کی آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی چمک عود آئی جب اس کی نظر ایک کمبل پر پڑی۔ اُس نے جلدی سے ہاتھ بڑھایا اور کمبل اٹھائی ہی تھی کہ اُس نے دیکھا کمبل کا دوسرا حصہ دوسرے شخص کے ہاتھ میں ہے۔دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر وہ شخص قمر الدین پہ چلایا۔

چھوڑ دو..... میں کہہ رہا ہوں چھوڑ دو۔

ارے بھائی..... سنو تو صحیح، مجھے اس کی بے حد ضرورت ہے۔

رحم کرو بھائی۔

میں نے کہا چھوڑ دو ورنہ.....

پھر اُس نے ایک زوردار لات ماری اور قمر الدین کے کمزور ہاتھوں سے کمبل چھوٹ گیا اور قمر الدین دور جا گرا۔

تھوڑی دیر کے بعد چاروں اور خاموشی تھی۔قمر الدین بوجھل قدموں سے شاملی کے میدان میں موجود اپنے ٹینٹ کی اور چلنے لگا۔راستے میں ایک ڈیڑھ کلومیٹر کی مسافت کے دوران اُس نے کئی بار دم لیا۔ایسا کرتے کرتے پتہ ہی نہیں چلا کب شام ہوئی اور رات نے کب دستک دی۔اپنے ٹینٹ کے قریب پہنچتے ہی دوسرے ٹینٹ سے، جہاں بیوہ شمیمہ اپنے پانچ بچوں کے ساتھ رہتی تھی، رونے کی آواز آرہی تھی۔وہ آواز شمیمہ کی ہی تھی۔شاید اپنی بدنصیبی پر رو رہی تھی۔قمر الدین اپنے ٹینٹ میں داخل ہوا سب سو رہے تھے یا پھر سونے کی.....

کہاں چلے گئے تھے، دن بھر کہاں غائب رہے، آج روٹی کھانے بھی نہیں آئے۔وہ سامنے روٹی رکھی ہوئی ہے کھالو۔

قمر الدین کی بیوی نے نیند سے جاگ کر کہا۔

نمو.....

ہاں وہ سوگئی۔قمرالدین کی بیوی نے جواب دیا اور ساتھ ہی کہنے لگی دن بھر تمہارا انتظار کرتی رہی۔ کہہ رہی تھی مجھے دادو کو کتاب دکھانی ہے۔

قمرالدین تھالی میں پڑی ہوئی روٹی کی اور ایسے دیکھنے لگا جیسے سوچ رہا ہو کہ اسے کیسے کھاتے ہیں۔

قمرالدین کچھ کھائے پیئے بغیر ہی لیٹ گیا۔اُس کے پیٹ میں رہ رہ کر درد اٹھ رہا تھا جو لات پڑنے کی وجہ سے ہو رہا تھا۔

کاش وہ کمبل.....

پھر نمو کا خیال آیا۔نمو کا خیال آتے ہی اُسے وہ کتاب بھی یاد آئی جو نمو اپنے سینے سے لگائے پھرتی تھی۔قمرالدین اٹھا اور نمو کے قریب گیا۔اس کا میلا چہرہ پھٹے پرانے میلے کپڑے، یہ سب ہونے کے باوجود بھی اُسے نمو کسی ننھی پری سے کم نہیں لگ رہی تھی۔وہ نیند میں مسکرا رہی تھی۔شاید پریاں ہنسا رہی تھیں اُسے۔وہ تھوڑا سردی سے کانپ بھی رہی تھی۔قمرالدین نمو کا چہرہ دیکھ کر اپنا درد بھول گیا اور نمو کو گھورتا رہا۔پھر دھیرے دھیرے اُس کے ہاتھوں سے کتاب نکالی جسے وہ سینے پر کھلی رکھ کر سو رہی تھی۔کتاب کا نیچے کا کونا جلا ہوا تھا۔

ہاں نمو یہ کتاب جلی ہوئی بستی سے اٹھا لائی ہے۔قمرالدین کو خیال آیا۔وہ کتاب کو دیکھتا رہا اور عجیب سوالوں میں گم ہو گیا.....

کتاب کے اوپر سجے ہوئے موٹے حروف سے لکھا تھا۔

''میرا دیش مہمان''۔

☆☆☆

بیتے موسم کا خط

یہ گناہ ہے
اور جرم بھی

ویسے بھی میری پیشہ وارانہ ذمہ داری اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ میں ایسا کروں۔

پر..... اگر میں نے ایسا نہیں کیا تو میرے دماغ کی نسیں پھٹ جائیں گی۔ یہ بند لفافے میں پڑا خط میرے اعصاب پر بُری طرح حاوی ہو چکا ہے۔ مجھے یہ لفافہ کھول کر یہ خط پڑھنا ہی ہوگا تب جا کے مجھے چین ملے گا اور قدرے راحت بھی۔

یہ خط ایک شخص کی دل کی دھڑکن ہے جسے وہ اپنے سے جدا نہیں کرنا چاہتا تھا پر میرے کہنے پر اُس نے آج یہ کیا۔ یہ خط منان صاحب کا ہے۔ منان صاحب کیا غضب کے آدمی ہیں اِس دلچسپ شخص سے ملاقات میری خوش بختی ہے۔

لگ بھگ دو سال قبل جب میری پوسٹنگ یہاں رائے گنج پوسٹ آفس میں ہوئی تو میں پہلے ہی دن سے اپنی پیشہ وارانہ ذمہ داری نبھانے میں جُٹ گیا۔ پہلے ہی دن سینکڑوں چھٹیاں رجسٹر پوسٹ کرنا' کمپیوٹر سے رسیدیں نکالنا' مسافت کے حساب سے' پیسے لینا ریز گاری نہ ہونے پر چڑ جانا' وقفے وقفے سے چائے کے گھونٹ' کمپیوٹر پر تھرکتی انگلیاں..... یہ سب ہو ہی رہا تھا کہ ایک شخص کونٹر کے سامنے ہاتھ میں

لفافہ لیے کھڑا تھا۔

''جی فرمایئے''۔

''یہ خط رجسٹر پوسٹ کرنا تھا''۔

آفس کے سبھی کولیگ میری طرف دیکھ رہے تھے اور مسکرا رہے تھے۔ میں کچھ سمجھ نہیں پایا۔

''جی جی لایئے''۔

وہ شخص جو کونٹر پر بنی تار کی جالی کے اُس طرف تھا۔ کچھ پریشان سا ہوا کچھ کچھ گھبرانے لگا پھر خط میری طرف بڑھاتے ہوئے جٹ سے واپس مڑا اور حال نما کمرے میں بچھے بنچ پر بیٹھ گیا۔

''ارے انہیں کیا ہوا؟ میں نے اپنے ایک ساتھی سے پوچھا۔

میرے ساتھی نے مجھے بتایا۔ یہ'' منان صاحب ہیں۔آپ سے قبل میری پوسٹنگ جب یہاں پر ہوئی تب سے انہیں دیکھ رہا ہوں۔ ہر ورکنگ ڈے پر یہاں آتے ہیں، قطار میں کھڑے ہوتے ہیں اور جب اپنی باری پر کونٹر پر آتے ہیں خط پوسٹ کرنے کے بجائے گھبرا کر اور پریشان حالت میں واپس چلے جاتے ہیں''۔

''کیا پاگل ہیں.....؟ میرا مطلب ہے دماغ میں کوئی خلل وغیرہ۔ میں نے اضطراری کیفیت سے پوچھا''۔

''نہیں ایسا کچھ نہیں ہے پر پتہ نہیں ان کے ساتھ کیا مسئلہ ہے۔ جو یہاں ہم سے پہلے کام کرتے تھے اُن کے مطابق چھ سات برس سے ایسا ہی کرتے آرہے ہیں۔ پر کسی کو کوئی علمیت نہیں کہ کیا مسئلہ ہے''۔

میں نے دیکھا منان صاحب بالکل صحیح بندے نظر آرہے تھے۔ پاگل پن

کے کوئی بھی آثار ان میں نہیں تھے۔لگ بھگ ساٹھ پینسٹھ سال کی عمر کا شخص، سنجیدہ چہرہ، آگے کے بال جھڑ چکے، باقی کے بال کالے اور سفید، موٹی موٹی مونچھیں جن سے اوپر کا ہونٹ بالکل بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی مگر خوب صورت بُوری آنکھیں، خوش لباس..... چیک کوٹ، بلیک پینٹ، گلے میں سرخ رنگ کا مفلر ڈالے ہوئے کچھ سوچ رہے تھے۔

کچھ دیر بعد وہ پوسٹ آفس سے باہر چلے آئے۔

پھر ایسا ہر ورکنگ ڈے میں ہوتا رہا۔

آج نہ جانے کیوں اور کہاں سے میں نے ہمت جٹائی جوں ہی منان صاحب خط ہاتھ میں لیے اپنی باری پر کونٹر کے نزدیک پہنچ کر واپس مڑے کہ میں اپنی کُرسی سے اُچھلا اور کیبن سے باہر آکر منان صاحب کے کاندھے پر ہاتھ رکھا وہ ہمیشہ کی طرح کسی گہری سوچ میں تھے۔''کیا بات ہے منان صاحب؟''۔

انہوں نے سر اٹھایا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر صرف اتنا کہا۔

''ہوں.....'' پھر ایک لمبی آہ بھری

تھوڑے وقفے کے بعد گویا ہوئے ''کچھ نہیں بیٹا.....'' نہایت محبت بھرے لہجے میں جواب دیا۔

''یہ خط رجسٹر نہیں کرائیے گا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہوں . . . . . .'' پھر سر اُٹھا کر میری طرف متذبذب نظروں سے دیکھا..... کچھ نہ کہا اور اٹھ کر چلے جانے والے ہی تھے کہ میں نے اُن کا ہاتھ پکڑ کر اُن سے کہا چلئے نیچے کینٹین میں چائے پیتے ہیں۔

وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائے۔

تھوڑی دیر بعد، گرم گرم چائے کی دو پیالیاں ہمارے سامنے رکھی ہوئی تھیں اور میں نے گفتگو کا آغاز یوں کیا۔

''میرا نام ضمیر ہے کچھ دن پہلے ہی میری پوسٹنگ یہاں ہوئی ہے۔ ہر ورکنگ ڈے آپ کو یہاں دیکھتا ہوں..... پر آپ سے کبھی بات نہیں ہو پائی۔ کچھ بتایئے نا''۔

''کس بارے میں؟'' انہوں نے تعجب سے جواب دیا۔

''اپنے بارے میں..... جی اپنے بارے میں کچھ بتایئے''۔ میں نے زور دے کر پوچھا۔

وہ مسکرائے، کوٹ کی داہنی جیب سے سگریٹ کا پاکٹ نکالا، سگریٹ سلگایا اور دھواں کچھ منہ سے، کچھ ناک کی نتھوں سے چھوڑتے ہوئے کہنے لگے۔

''اب مجھے بھی یاد نہیں کہ میں کون ہوں'' پھر توقف کے بعد ''خیر جتنا یاد آتا ہے اتنا بتاتا ہوں''۔

''متوسط طبقے کا ایک عام انسان، اوسط درجے کا، ایک سرکاری محکمے میں ملازم تھا۔ جوانی میں کافی عشق کیے۔ پھر شاعری کی دیوی مہربان ہوئی کبھی کبھی کہانیاں بھی لکھیں..... حُسن کی پرستش کرتا رہا، کافی خوش مزاج رہا ہوں پھر شادی ہوئی اور بچے بھی۔ پھر اچانک محسوس ہونے لگا زندگی کے بچے کچے دن شاید ایسے ہی گذریں گے۔ پر پتہ نہیں کیوں کچھ کمی سی محسوس ہو رہی تھی۔ لڑکپن سے جوانی تک یا پھر ادھیڑ عمر ہونے تک خواب میں جسے دیکھتا تھا وہ کبھی نہ ملی''۔

''کون؟'' میں نے بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

''ایک حسین پیکر جس کا نام میں نے من ہی من ''خواب رُتوں کی شہزادی'' رکھا تھا۔ جب کہ عمر کی چالیس بہاریں بھی گذر چکی تھیں..... پھر ایک روز''۔

''ایک روز کیا؟''میں نے حیرت اور تجسس کی ملی جلی کیفیت سے دوچار ہوتے ہوئے پوچھا۔

منان صاحب مسکرائے اور کہنے لگے''پھر میں نے ایک دن اُس کو دیکھا''۔

''کس کو'خواب رُتوں کی شہزادی کو''؟ میں نے یہیں سے جواب دیا۔

''جی''۔وہ پھر مسکرا کر بولے۔

''ایک دن ایک سیمینار میں اس کی جھلک دیکھی۔دنیا جیسے تھم گئی۔مجھے اس بات کا قطعی امکان نظر نہیں آرہا تھا کہ میں کبھی اُسے دیکھ پاؤں گا۔پر شومئی قسمت وہ ایک جھلک دکھا کر غائب ہوگئی۔مگر میری اضطرابی کیفیت رنگ لائی۔ جلد ہی قسمت مجھ پر مہربان ہوگئی اوران سے ملاقات ہوئی۔وہ ملاقات اب تک یاد ہے''۔

میں نے اسے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔یوں لگا کہ جیسے وہ میرے تخیل سے اتر کر آئی ہو۔ایسا بھی نہیں تھا کہ میں نے اس جیسی خوب صورت لڑکی پہلے کبھی دیکھی نہ تھی'مگر سچ یہ ہے کہ ویسی نہ دیکھی تھی' کچھ تھا ضرور اس میں'اس کی نیلی آنکھوں میں ایک خاموش شرارت تھی'اس کی مسکراہٹ میں زندگی مسکراتی تھی اور وہ جب دھیمی آواز میں باتیں کرتی تو یوں لگتا تھا کہ جیسے چاروں طرف جھل ترنگ سے بج رہے ہوں۔میں نے اسے آج دوسری دفعہ دیکھا تھا مگر ابھی تک اس سے کوئی بات نہ ہو پائی تھی۔یوں تو میں میرے دوستوں کے مطابق ہرفن مولا تھا۔اچھا مقرر بذلہ سنج۔ ادبی حلقوں میں میری خوب پذیرائی ہوتی اور مشاعرے تو میں یوں چٹکی بجاتے ہی لوٹ لیتا تھا۔مگر آج وہ سامنے تھی تو مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میرے پاس الفاظ کا آکال پڑا ہے۔میں گنگ اُسے ہی دیکھ رہا تھا۔وہ مجھے یوں متذبذب دیکھ کر

ہلکے سے مسکرائی اور دھیمے لہجے میں وہی جھل ترنگ لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوئی۔

''آپ سے مل کر بے حد خوشی ہوئی''۔

''جہ......جی ......جی..... مجھ مجھے بھی'' بڑی مشکل سے بول پایا جیسے کسی نے گہری نیند سے جگایا ہو۔

''آ... آپ کیوں نہیں آتی ہیں ہماری محفلوں میں؟ میں نے ہمت کر کے پوچھ ہی ڈالا مگر آج پہلی بار مجھے میرے اپنے ہی الفاظ اجنبی معلوم ہو رہے تھے۔

''آئیں گے کبھی جلدی کیا ہے''۔ وہ اسے دلربائی مگر معصوم انداز میں بول رہی تھی۔ کانوں میں پھر ایک بار جھل ترنگ بجا۔

''میڈم۔ صاحب باہر انتظار کر رہے ہیں''۔ شوفر نے آ کر اطلاع دی۔

''او۔ ہاں آ رہی ہوں''۔ اس نے کچھ یاد کر کے اپنے سابقہ انداز میں کہا اور میری طرف مسکراتے ہوئے گویا ہوئی۔

''منان صاحب اب اجازت دیجئے۔ خدا حافظ'' اور وہ شوفر کے پیچھے ہی نکل گئی اور پل بھر کو میرے چہرے پر بھی مسکراہٹ ٹھہری۔ میری خالی نظروں نے دور تک اس کا تعاقب کیا اور پھر ایک بار سکتے کی سی حالت مجھ پر طاری ہوگئی۔

میں نے لاکھ اپنا سر جھٹکنے کی کوشش کی مگر وہ بار بار ذہن میں کسی خیال یا کسی پیکر میں ڈھل کر سامنے آتی رہی اب تک کبھی ایسی حالت نہ ہوئی تھی، میں بہت پریشان تھا کہ اچانک فون کی بیل ہوئی تو پھر ایک بار چونکا۔

''ہاں پاپا پروجیکٹ کے لیے مجھے مصنوعی پیڑ، آئس کریم سٹکس، گلو اور پوسٹر کلریس چاہیے۔ دیکھئے بھولیے گا نہیں''۔ میری بارہ سال کی بیٹی نے مجھے کوئی تیسری

بار یاد دلایا۔ میں نے بے خیالی میں حامی بھر لی اور مشاعرہ پڑھنے چلا گیا۔مصدق اور آمر کی درمیانی نشست پر بیٹھ گیا۔تھوڑی دیر میں ہی مشاعرہ شروع ہونے والا تھا۔مجھے بھی چند غزلیں اور نظمیں جو میں نے حال ہی میں لکھی تھیں سنانی تھیں۔مگر میرا دل تو اچاٹ ہو چکا تھا۔یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ ساری رونق اپنے ساتھ لے گئی ہو۔ ماحول میں عجیب سی گھٹن در آئی تھی۔ میرا نام لیا گیا تو میں پھر ایک بار چونک پڑا۔دل چاہ رہا تھا کہ معذرت کر لوں مگر ایسا کرنا گویا اپنے لیے نہ جانے کتنے سوالات کا در کھولنا تھا۔سو بادل نہ خواستہ میں ڈائیس پر آیا تو ایک دم سے مجھے اس کی مسکراتی ہوئی نیلی آنکھیں یاد آئیں۔

جاگتے میں بھی سوتی ہیں
کچھ آنکھیں ایسی ہوتی ہیں
خواب ہی پروتی ہیں
کچھ آنکھیں ایسی ہوتی ہیں

میں نے ان کے تصور میں اپنی نظم پڑھی۔تو ہر طرف واہ واہ، مکرر مکرر، کی آوازیں گونجنے لگیں۔ایسا نہیں تھا کہ آج پہلی بار میں نے محفل کو لوٹا ہو مگر آج مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جو کچھ میں نے کہا اس کا لفظ لفظ سچا ہے۔میں نے سچ میں ان لمحوں کو جیا تھا۔

''کیا تم اس بات پر یقین کرو گے''سگریٹ اپنے پیر سے بجھاتے ہوئے منان صاحب کہنے لگے۔

''کس بات کا یقین منان صاحب؟''۔

''کہ عشق کی کوئی عمر نہیں ہوتی اور نہ کوئی حد''۔انہوں نے چائے کی پیالی سے

نظریں اٹھا کر میری طرف اعتماد سے دیکھا۔ ''مجھے اس کا کوئی خاص تجربہ نہیں''۔
میں نے شرماتے ہوئے جواب دیا۔
منان صاحب پھر شروع ہو گئے۔
ہم ملنے لگے ملاقاتوں کا سلسلہ چل پڑا۔
شادی شدہ اور بال بچوں والی وہ بھی تھی اور میں بھی۔ میری ضد پورا کرنے کی خاطر وہ مجھ سے ملنے بھی آتی رہی۔
میں نے بارہا اس سے کہا۔
''آپ دیوی ہیں''۔
''دیوی''..... وہ مسکراتی۔
''دیوی..... اور میں آپ کا داس..... کیا میں آپ کے پیروں کو چوم سکتا ہوں؟''
''ہرگز نہیں''..... وہ گھبرا کر جواب دیتی۔ میں کہتا چلئے کوئی نہیں۔
اور میں اس کے پیروں کی دھول اپنے آنکھوں پر ملتا۔
اور خود کو دنیا کا خوش نصیب انسان تصور کرتا پھر پتا ہی نہیں چلا کہ کیسے دیکھتے ہی دیکھتے ۲۰ سال گذر گئے۔ بچے کب بڑے ہوئے اور کب ان کی شادیاں ہوئیں پر..... پر وہ اپنی بیٹی کے ساتھ جسے وہ زیادہ لاڈ پیار کرتی تھیں اور جو Foreign میں سٹل ہوئی تھی، اس کے پاس وہی چلی گئی۔
میں نے اُسے اکثر کہا کہ ''میں آپ کے بغیر جی نہیں سکتا'' وہ سنجیدہ ہوتی اور کہتی ''ایسا نہ کہا کریں''۔
آج سات سال دو مہینے اور دس دن ہو گئے وہ واپس نہیں آئیں۔ اس کے

بغیر جو زندہ رہنے کا اور جینے کا کُفر مجھ سے ہو گیا ہے اُس کی روداد اور معافی اس خط میں لکھی ہے۔ روز آتا ہوں کہ یہ خط ارسال کروں پر یہ خیال ستاتا ہے کہ کہیں اس خط کا جواب نہ آیا تو میرے بھرم کا کیا ہوگا یا پھر اگر یہ خط اس کی بیٹی داماد یا ان کے بچوں کے ہاتھ لگا تو کیا ہوگا۔ اسی لیے.....

تھوڑی دیر خاموشی چھائی رہی میں نے سارا ماجرا سمجھنے کی کوشش کی اور منان صاحب سے پوچھا۔

''اگر آپ کو اپنی محبت پر یقین ہے تو ان سب باتوں کی کیوں پرواہ کرتے ہیں۔ لائے خط مجھے دیجئے میں اسے رجسٹر کرتا ہوں''۔ منان صاحب نے کانپتے ہاتھوں سے کوٹ کی جیب سے خط نکالا اور میری طرف بڑھایا۔

چلنے سے پہلے منان صاحب میری طرف مڑے اور مجھے غور سے دیکھا اور مسکرائے۔

اب یہ خط میرے سامنے پڑا ہے اس میں مقناطیسی کشش ہے جو مجھے اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔

نہیں..... نہیں۔

میں یہ خط نہیں پڑوں گا۔ یہ منان صاحب کی امانت ہے۔

اس میں انہوں نے ان تمام تکالیف کی روداد رقم کی ہوگی جو انہوں نے اپنی محبت سے دوری کی وجہ سے محسوس کی ہے۔

نہیں نہیں..... یہ گناہ ہے اور جرم بھی۔

پر..... پر..... اگر میں نے ایسا نہ کیا تو میں کیسے خود کو سنبھال پاؤں گا۔ مجھے اس تمام اضطراری کیفیت سے کیسے نجات ملے گی۔ منان صاحب جیسی پُر کشش

اور دلچسپ شخصیت ان کی داستان عشق سننے کے بعد اب یہ لازمی ہوگیا ہے کہ میں یہ خط پڑھوں۔

اُف خدایا۔

یہ کیسی اذیت یہ کیسی مصیبت ہے جو مجھ پر نازل ہوگئی ہے۔لفافہ کھولنے پر میں حیرت اور پریشانی کی دلدل میں دھنستا ہی چلا جارہا ہوں کیونکہ لفافے کے اندر کورے کاغذ کے سوا کچھ بھی نہیں۔

☆☆☆

نیا آدمی

(2)

(IN SEARCH OF BETTER WORLD)

''زندگی ایک عذاب بن کر رہ گئی۔''

''پریشانیاں دن بہ دن گھٹنے کے بجائے بڑھتی ہی جا رہی ہیں۔

''مگر اب شاید خوشیاں.....''

کُسم دیوی اپنی پڑوسن نرملا کو اپنا دکھڑا سنا رہی تھی۔

''ان کا جب ہسپتال میں علاج ہو رہا تھا ان ہی دنوں میں نے ان سے منت سماجت کی اور خود کا اور بچوں کا واسطہ دیا اور کہا کہ وہ بے کار اور خوامخواہ کے جھمیلوں میں نہ پڑا کریں اور ان سے وعدہ بھی لینا چاہا لیکن انہوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا ''کوشش کروں گا وعدہ نہیں کر سکتا''۔

پر وہ اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے۔

چند مہینے پہلے کی بات ہے ہمیں ہمارے نانک پور کے رشتہ داروں نے شادی میں دعوت پر بلایا۔ میں نے انہیں جانے کے لیے راضی کر لیا۔ جس دن ہم نانک پور کے لیے نکل پڑے اس دن میں اور بچے بہت خوش تھے، موسم بھی خوشگوار تھا، ہم ٹیکسی میں بیٹھ کر چل دئے۔ ہائے وے پر دیکھا سارا ٹریفک جام پڑا ہے۔ بہت ساری گاڑیاں پتا نہیں کیوں رکی پڑیں تھیں۔ ڈرائیور نے بتایا کافی ٹائم لگ سکتا ہے۔

یہ سنتے ہی وہ گاڑی سے اترے اور پیدل آگے چل دیئے۔ کچھ دیر بعد گاڑیاں ذرا ذرا کر کے حرکت میں آنے لگیں۔ بچوں کو اور مجھے فکر لاحق ہونے لگی۔ ڈرائیور بھی بار بار پوچھنے لگا۔

ارے یہ صاحب کہاں چلے گئے؟

تھوڑا آگے چل کر ہم نے دیکھا وہ کڑی دھوپ میں ایک ہاتھ میں چھڑی لیے اور رہونٹوں میں وہسل دبائے ٹریفک کر مچاری کی مدد کر رہے ہیں۔ میں نے دیکھا وہ پسینے میں نہائے ہوئے تھے، پر وہ زور زور سے وہسل بجا رہے تھے اور اپنے بازو کو ہوا میں لہرا لہرا کر گاڑیوں کو چلنے کا اشارہ کر رہے تھے۔ لوگ انہیں حیرت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے اور کچھ لوگ ہنس رہے تھے۔ ہماری سواری دیکھ کر وہ ٹیکسی کے نزدیک آئے اور مجھے سمجھانے لگے۔

آپ لوگ چلیں میں بھی آتا ہوں۔

میں غصہ ہوئی اور ان پر چلا کر کہا۔

''چلئے اندر آیئے! بہت ہو گیا' آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟ دیکھئے نا! سارے لوگ ہنس رہے ہیں۔''

''نہیں کُسم! دیکھو وہ وہاں تک ساری گاڑیاں پہلے کلیئر کرنی ہوں گی ورنہ یہ سارے لوگ یہاں جام میں پڑے پریشان رہیں گے۔''

وہ دیر رات گئے شادی میں پہنچے جب تک شادی کی ساری رونقیں ماند پڑ چکی تھیں اور دعوت بھی ختم ہو چکی تھی۔

''سُن رہی ہو نا نرملا؟''

پھر ایک دن پتا نہیں مجھے کیا سوجھی کہ میں نے ان سے کہا۔

''سب کی پرواہ تو کرتے ہو بس میرا ہی خیال نہیں۔ پتا ہے کتنے دن ہو گئے ہم ایک ساتھ کہیں گھومنے یا شاپنگ کے لیے نہیں گئے''۔

''کون سی بڑی بات ہے، جب کہو چلتے ہیں۔''

''میں نے موقعے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا تو پھر کل چلیں۔''

دوسرے دن وہ اور میں گھومنے اور شاپنگ کرنے کے لیے نکل پڑے۔ ایک جگہ سڑک پر بہت بھیڑ اکٹھا تھی ہم لوگوں میں جگہ بناتے ہوئے آگے بڑھے اور دیکھا کہ ایک شخص زخمی حالت میں بیچ سڑک پر پڑا ہوا ہے۔ اسے کسی تیز رفتار گاڑی نے اڑا دیا تھا۔ کافی خون بہہ چکا تھا اور وہ زخمی حالت میں تڑپ رہا تھا۔ پر کوئی بھی آگے بڑھ کر اُسے اٹھانے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔

''پولیس کیس ہے بھائی!''

''اس کو ہسپتال لیا تو خوامخواہ جھمیلوں میں پڑنا ہوگا۔''

بھیڑ میں ایک شخص دوسرے سے کہہ رہا تھا۔

پر ان سے کہاں دیکھا گیا۔ فوراً آگے بڑھے تو میں نے بازو پکڑ کر روک لیا۔

''کیا کر رہے ہیں؟ اتنے سارے لوگ ہیں، ان میں سے تو کوئی نہیں آگے آ رہا۔ پھر آپ کیوں؟''

''کیا کہہ رہی ہو گُسم! یہ ہسپتال نہیں پہنچا تو مر جائے گا۔ چھوڑ دو مجھے۔''

وہ سڑک کے ایک طرف چل رہے ٹریفک میں کود پڑے، گاڑیاں روکنے کی کوشش کرنے لگے۔ پر کوئی گاڑی والا نہ رُکا۔ ایک شخص نے گاڑی روکی بھی لیکن جب اسے پتا چلا کہ زخمی شخص کو ہسپتال لے جانا ہے تو اس نے صاف کہہ دیا۔

''نہیں نہیں! میری گاڑی کی سیٹ خراب ہوجائے گی۔'' یہ دیوانوں کی طرح منت سماجت کرتے رہے اور مدد مانگتے رہے۔ پھر ایک ٹیکسی والا رکا' اس نے پانچ سو روپے مانگے۔

''ہاں ہاں! دوں گا بھائی بس میری مدد کر دو۔''

یہ اُس زخمی شخص کو ٹیکسی میں بٹھا کر چل دیئے۔ یہ بھی یاد نہیں رہا میں ان کے ساتھ ہوں۔ میں اُلٹے پیرا کیلے واپس چلی آئی۔ یہ دیر رات گئے تک واپس نہیں لوٹے تو میں نے ان کے آفس کے ساتھی شرما جی کو فون کر کے سارا واقعہ سنا دیا اور وہ آدھی رات کے قریب انہیں ساتھ لے کر گھر آئے۔ پتا چلا تھانے سے آ رہے ہیں۔ شرما جی نے بتایا پولیس انہیں ہسپتال سے کچھ سوال جواب کے لیے تھانے لے گئی تھی۔شرما جی سے یہ بھی پتا چلا انہوں نے اس زخمی شخص کی جان بچانے کے لیے خون بھی دیا۔

یہ تو میرا ہی کلیجا ہے جو ان کے ساتھ نبھا کر رہی ہوں۔کبھی کبھی من میں آتا ہے خودکشی کر لوں لیکن پھر بچوں کا خیال آتا ہے۔

پھر ایک دن ایک بڑی پریشانی نے ہمارے گھر کے دروازے پر دستک دی۔ یہ آفس میں جس عہدے پر ہیں وہ کوئی خاص بڑا عہدہ نہ سہی مگر کام کے اعتبار سے نہایت ہی اہم ہے۔ان کے دستخط کے بغیر کوئی بھی فائل آگے نہیں بڑھتی۔ایک دن انہوں نے ایک شخص کی فائل بغیر زیادہ جانچے پرکھے آگے کے لیے ریکمنڈ کر دی۔بعد میں پتا چلا اس شخص نے جو بھی کاغذات جمع کروائے تھے وہ سب جعلی تھے۔

اور ..... اور انہیں..... انہیں سسپنڈ کر دیا گیا۔ان کے دوست اور دفتر

کے سبھی ساتھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ کبھی بھی روپے پیسے کی لالچ میں آ کر ایسا کام نہیں کر سکتے بلکہ جو انہیں قریب سے جانتے ہیں وہ ان کی بے حد عزت کرتے ہیں پر کچھ لوگ انہیں بے وقوف بھی سمجھتے ہیں۔ لیکن مسئلہ کچھ ایسا تھا کہ آفس والوں کو انہیں سسپنڈ کرنا ہی پڑا۔ پورا دن گھر میں بیٹھے سوچتے رہتے ہیں۔ میں جب پوچھتی ہوں تو کہتے ہیں۔

''مجھے اس بات کا افسوس نہیں کہ اس شخص نے مجھے دھوکا دیا یا اور مجھ سے غلط کاغذات پر دستخط لیے۔ بلکہ افسوس اس بات کا ہے کہ اس نے خود کو دھوکا دیا۔ بھلا ایک انسان خود کو کیسے دھوکا دے سکتا ہے۔''

مجھے حیرت ہوتی ہے کہ اتنا ہونے کے باوجود یہ ابھی بھی اس شخص کے بارے میں سوچتے ہیں جس نے انہیں اتنا بڑا دھوکا دیا۔ پھر ہمیشہ کی طرح مصیبت کی گھڑی میں مجھے ایشور یاد آئے۔ پتا نہیں میں نے کیسے ہمت جٹائی اور خود کو ٹوٹنے سے بچایا اور ان کی ڈھارس بندھائی اور ان سے پرسوں کہا۔ چلئے مندر چلتے ہیں' بھگوان کے درشن سے کشٹ دور ہو جائیں گے اور ہماری بگڑی بھی بن جائے گی۔ ہم اکٹھے مندر چل دیئے۔ مندر پہنچتے ہی پتا نہیں مجھے یہ خیال کہاں سے آیا کہ میری چپل جو میں پہن کے آئی ہوں' کہیں مندر کی سیڑھیوں سے چوری نہ ہو جائے۔ مجھے نہیں پتا وہ میرے اس خیال کو کیسے بھانپ گئے مندر کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئے اور مجھ سے کہا۔

''جاؤ درشن کر کے آ جاؤ۔''

''آپ نہیں چلیں گے؟ میں نے حیرت سے پوچھا۔''

''نہیں نہیں! میں یہی پر ٹھیک ہوں۔''

ہم مندر سے واپس لوٹے تو میں نے کہا۔

''مجھے بالکل اچھا نہیں لگا۔ آپ نے درشن نہیں کیے۔''

وہ میری طرف نظریں اٹھائے بغیر کہنے لگے۔

''اُس درشن سے بھلا کیا فائدہ جہاں دھیان ایشور کے بجائے چپل کی طرف ہو۔''

میں شرمندہ بھی ہوئی اور حیران بھی۔

''اچھا اس وقت بھائی صاحب کہاں ہیں؟''

نرملا نے کافی دیر کے بعد لب کشائی کی۔

''وہ آج آفس گئے ہیں' انہیں آج تقریباً چھ مہینے کے بعد آفس والوں نے اینکوائری کمیٹی کے سامنے حاضر ہونے کے لیے کہا تھا۔ ان کے ساتھی شرما جی کہہ رہے تھے' آفس میں سبھی' یہاں تک کہ بڑے صاحب بھی' سیوک کمار جی کے ساتھ نرمی کا رویہ اختیار کرنے والے ہیں۔''

''سنتی ہو نرملا! اب شاید خوشیاں.....''

''اب پریشانی کے دن ختم ہونے والے ہیں۔ آج ان کی نوکری پھر سے بحال ہونے والی ہے۔ اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اب ان سے وعدہ لے لوں گی اور کہوں گی کہ اب تو ان بے کار کے جھمیلوں میں نہ پڑیں۔ کسی پر آنکھیں بند کرکے بھروسہ نہ کریں' دوسروں کے لیے اب جینا چھوڑ دیں' دوسروں کی پرواہ کرنا چھوڑ دیں' اس ظالم دنیا میں رہنا ہے تو سنبھل کر رہنا ہوگا۔ نہ صرف سنبھل کر بلکہ چالاکی سے رہنا ہوگا۔ ورنہ۔''

''ورنہ..... ورنہ یہ دنیا ہرگز جینے نہ دے گی۔''

اہا..... اہا..... اہا۔

سیوک کمار گلا کھنگالتا ہوا گھر میں داخل ہوا اور پڑوسن نرملا گُسم دیوی کو دلاسہ دے کر چلی گئی۔

سیوک کمار اپنی بیوی کُسم دیوی سے نظریں چُرا رہا تھا۔
''کیا ہوا؟''
''کہیے نا کیا ہوا؟''
''آپ کی نوکری بحال ہوگئی نا؟.....''
''چلئے جلدی سے کہیے نا کہ کیا فیصلہ ہوا؟''
''وہ.....وہ انہوں نے کچھ کاغذات تیار رکھے تھے۔بس وہ.....وہ مجھے دستخط کرنے کے لیے کہا اور یہ بھی کہا کہ باقی وہ خود سب سنبھال لیں گے۔''
''تو؟'' کُسم دیوی نے جذباتی ہوکر پوچھا۔
''تو آپ نے دستخط کردیئے نا؟''
کُسم ان کاغذوں میں صاف لکھا تھا جو فائل، جس کی وجہ سے یہ سب پریشانی ہوئی، میں نے ریکمنڈ کی ہی نہیں تھی۔
''ہاں تو ٹھیک ہے نا۔''
''نہیں بالکل نہیں۔''
''بھلا میں اس غلطی سے کیسے مکر جاؤں جو مجھ سے ہوئی ہے۔''
کُسم دیوی کا دل زوروں سے دھڑکنے لگا۔
''تو؟'' کُسم دیوی نے مزید پریشان ہوکر پوچھا۔''
''تو کیا؟ میں نے.....''
میں نے وہ کاغذ پھاڑ دیئے اور چلا آیا۔
''ان کاغذوں پر دستخط کرنے سے بہتر تھا میں خودکشی کر لیتا۔''
سیوک کمار نے نظریں چراتے ہوئے جواب دیا۔

کُسم دیوی کی امید کے دیئے بجھ گئے اور اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا پھر اسے اچانک اپنے بھائی کی باتیں اور نصیحت یاد آئی۔

''سیوک کمار ہم میں سے تو ہے لیکن ہم جیسا نہیں' یہ تو بالکل نیا آدمی ہے' ایک الگ ماٹی سے بنا نیا آدمی۔ بہن تم اس کو اپنے آکار میں ڈھالنے کی غلطی کبھی نہ کرنا ورنہ یہ ٹوٹ جائے گا بکھر جائے گا''۔

کُسم دیوی سیوک کمار سے لپٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

☆☆☆

ادھوری کتاب کا خدا

مجھے اب بہت دن ہو گئے اس شہر میں۔

آج کام مکمل ہو جائے تو آگے بڑھوں۔ مجھے جلدی سے شہر کے مضافات میں پہاڑی کے دامن میں واقع زیارت گاہ پر پہنچنا ہوگا۔ بابا وہی پر ہوں گے۔ اب ڈیڑھ مہینہ ہونے کو آیا ہے جب میں پہلی دفعہ اس زیارت گاہ پر ان سے ملا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ بابا نے آواز دے کر مجھے پاس بلایا اور پوچھا۔

''کون ہو تم؟''

''جی مسافر۔''

''کیا کرتے ہو؟''

''شہر شہر گاؤں گاؤں بھٹکتا ہوں اور لوک گیت، کتھائیں اور کہانیاں جمع کرتا ہوں اور ان کو لکھ کر محفوظ کر لیتا ہوں''۔

''ہوں! یہ بھی کوئی کام ہوا بھلا۔ بابا نے حیرت سے پوچھا''۔

''جی حضرت''۔

''میرا یہی کام ہے اور شاید میرا مقدر بھی۔ پھر میں نے پہلی دفعہ بابا کو غور سے دیکھا۔ ایک ایسا بزرگ جس کے کپڑے پرانے اور میلے تھے لیکن جس کے چہرے پر نور تھا اور ایک عجیب کشش تھی، سفید چہرے پر بڑی ہوئی داڑھی اور ماتھے پر پسینے کی

بوندیں۔

''اور آپ کون ہیں حضرت، میں نے پوچھا''۔

بابا ملنگی۔

وہ مسکرائے اور بولے۔

''سب مجھے اسی نام سے پکارتے ہیں۔ برسوں سے اسی چوکھٹ پر پڑا ہوا ہوں کہ کبھی اس ولی کامل کی نظرِ عنایت ہوگی اور سکون سے میری روح جسم سے جدا ہوکر پرواز کرے گی''۔

''اچھا ایک بات سنو''۔ بابا نے اوپر آسمان کی طرف نظریں اٹھائیں۔ کچھ سوچنے لگے اور پھر فرمایا۔

''میں کچھ لکھنے کے لیے کہوں تو لکھو گے۔؟''

''جی ضرور۔ میں نے بے جھجک ہوکر کہا۔ پر لکھنا کیا ہے؟''

''داستان۔ ایک داستان عشق''۔ بابا نے فرمایا۔ ''پر اس کو لکھنے میں تمہیں کئی دن لگیں گے''۔

''میرا کام ہی یہی ہے' میں نے جواب دیا''۔

''یہ داستان سفیان اور حیا کی داستان ہے''۔ بابا نے فرمایا۔

پھر کیا تھا۔ بابا کہتے گئے میں لکھتا گیا۔ ہر روز نیا باب مجھ سے رقم کرواتے گئے۔ یہ داستان عشق کچھ یوں ہے۔

سفیان ایک متوسط درجے کا خوب صورت نوجوان ہے۔ تعلیم وتربیت اچھی پائی اور شکل وصورت بھی۔ تعلیم سے فارغ ہوکر کالج میں لیکچرار بنا۔ جوانی میں عشق کا بخار سب کو چڑھتا ہے' اُسے بھی چڑھا اور اپنے دور کے رشتے کی ایک لڑکی حیا کے

عشق میں گرفتار ہوا۔قسمت اچھی تھی عشق کی دعا کو قبولیت ملی اور حیا بھی اس سے ٹوٹ کر چاہنے لگی۔شادی ہوئی‘ آپس میں دکھ سکھ بانٹے اور تین بچوں کے ماں باپ بن گئے۔

پہلے تو بابا نے سفیان کے بچپن اور جوانی تک کئی قصے رقم کروائے پھر حیا کے حسن اور اس کی وفا شعاری پر کئی صفحے لکھوا ڈالے۔مجھے ساری روداد کچھ خاص معلوم نہ ہوئی‘ اسی لیے ایک دن پوچھ بیٹھا۔

’’تو بابا،سفیان اور حیا اپنی محبت کے سہارے اور تین بچوں کے ساتھ ایک خوشگوار زندگی گذارنے لگے۔پھر کیا ہوا؟‘‘

’’پھر سفیان کی زندگی میں ایک لڑکی آئی۔بابا نے فرمایا۔‘‘

’’لڑکی!‘‘

’’ہاں لڑکی جس کا نام تھا بینش۔ایک نہایت آوارہ طبیعت‘ جھوٹی اور مکار لڑکی‘ جو جہاں جاتی عشق کا جال پھینک کر دوسروں کو پھانس لیتی۔ان میں لڑکے ہی نہیں ہوتے بلکہ بال بچوں والے مرد بھی ہوتے۔بینش تھی تو سفیان کی شاگرد اور عمر میں بارہ تیرہ سال اس سے چھوٹی۔مگر اس نے یہ جال سفیان پر بھی پھینکا اور اسے اپنی طرف راغب کر ہی لیا۔‘‘

’’مگر بابا‘

سفیان کی محبت تو حیا ہے نا‘ اس کی شریک حیات اس کی ہمسفر۔تو وہ بینش کی چکر میں کیسا پڑ گیا۔‘‘

’’مرد کے پھسلنے کا کوئی وقت نہیں ہوتا۔‘‘

’’بینش نے اسے اپنے جال میں پھانس لیا اور وہ اُس کے پیچھے دیوانہ ہو کر سب کچھ بھول گیا۔یہاں تک کہ اُس کی اصل محبت‘ اس کی چاہت‘ اس کی ہمسفر حیا کو

بھی اور اپنے بچوں کو بھی ۔بینش نے اسے اپنی جھوٹی محبت کا بھرم دلایا اور دن بہ دن اس کے قریب آتی گئی ۔اتنے قریب کہ......''

بابا کہتے کہتے رُک گئے ۔

پھر بابا نے بینش کی نادانیوں کے قصے رقم کروائے ۔عشق اور مُشک چھپائے نہیں چھُپتے ۔ بھلا سفیان اور بینش کا یہ کھیل حیا سے کب تک چُھپتا۔آخر کار اُسے پتہ چل ہی گیا۔اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور پیروں تلے زمین کھسک گئی ۔سفیان کے ساتھ دس سال پہلے کے اپنے شادی کے فیصلے پر وہ پچھتانے لگی ۔اُسے سفیان کی بے وفائی سے بہت دکھ پہنچا۔

یہاں بینش کا دل بھی کسی اور کی چاہت کے لیے بے قرار ہونے لگا۔ وہ اب سفیان سے اُوب چکی تھی اور کسی نئے شکار کی تلاش میں لگ گئی ۔ بالآخر اُسے ایک ہم عمر لڑکا مل ہی گیا۔جس کے ساتھ وہ محبت کی پینگیں بڑھانے لگی ۔اب جب بھی سفیان اُسے ملنے کی کوشش کرتا تو وہ نہایت ہی بے رخی سے پیش آتی ۔ پھر جلد ہی بینش نے سفیان سے تمام تر رابطے منقطع کر دیئے۔سفیان خود کو سنبھال نہ پایا کیونکہ اُسے دوہری مار سہنی پڑی۔اول تو اپنی وفا شعار شریک حیات سے بے وفائی کا غم اور دوسرا بینش کی بے وفائی ۔ وہ اپنے کیے پر پر نادم بھی تھا اور شرمندہ بھی ۔حیا نے اسے گھر سے نکال دیا تھا۔بینش نے بھی اُسے نہیں اپنایا وہ در در بھٹکتا رہا اور پھر پتہ نہیں کہاں غائب ہو گیا۔

میں نے بابا کو بیچ میں ٹوک کر پوچھا''کہیں سفیان نے خودکشی تو نہیں کی یا وہ مَر وَر تو نہیں گیا؟۔''

''نہیں...... نہیں، بابا مسکرائے ۔اگر وہ مر گیا ہوتا تو اُس کی روح سفید کبوتر

بن کر نیلے آکاش میں کہیں اُڑتی ہوئی دکھائی دیتی۔ بابا نے پھر کہنا شروع کیا''۔

''کچھ عرصہ گذرنے کے بعد حیا کو یہ احساس ہوا کہ سفیان آخر اس کا شوہر ہے اُس کے بچوں کا باپ بھی وہ سفیان کی غلطی کی سزا خود کو تو دے سکتی ہے پر بچوں کو نہیں''۔ بابا کھانستے ہوئے کہنے لگے''عورت آخر موم کی طرح پگھل جاتی ہے۔حیا نے سفیان کو معاف کرنے کا فیصلہ کیا۔مگر اب مسئلہ یہ تھا کہ آخر سفیان کہاں گیا اور کہاں سے اُسے ڈھونڈ کر واپس لائے''۔

ادھر بینش من ہی من شرمندہ ہوئی اور سوچنے لگی کہ اس کی نادانیوں کی وجہ سے ایک ہنستا کھیلتا گھر ٹوٹ گیا اور اُسے سفیان کی اُس کے تئیں محبت رہ رہ کر یاد آنے لگی۔ اُسے یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ سفیان کو گھر والوں نے ٹھکرا دیا ہے۔ اُسے لگا کہ اُسے واپس سفیان کے پاس جانا چاہیے اور اُسے معافی مانگ لینی چاہیے اور ر اگر سفیان راضی ہوا تو وہ ایک دوسرے کے ساتھ زندگی کی نئی شروعات کریں گے۔ اس نے بھی سفیان کی تلاش شروع کی۔ اتفاق کی بات ہے کہ ایک ہی دن حیا اور بینش دونوں کو سفیان کا پتہ چل گیا۔ حیا اور بینش دونوں پاگلوں کی طرح دوڑتی بھاگتی ہوئی سفیان سے ملنے نکل پڑیں۔ بابا کہتے کہتے رُک گئے۔

''پھر کیا ہوا؟''

میں نے تجسُس سے پوچھا۔

''بہت دیر ہوگئی ہے..... بابا نے مجھ سے کہا جاؤ کل آنا یہ قصہ مکمل کر لیتے ہیں۔تم بھی اب تھک گئے ہوگے''۔

میں اٹھا اور واپس مڑنے سے پہلے بابا سے کہا۔''یہ کہانی پھیلتے پھیلتے اب ایک کتاب کی شکل اختیار کرنے کو ہے''۔ بابا میری بات پر مسکرائے اور فرمایا''چلو یہی

سہی۔کل اس کتاب کومکمل کر لیتے ہیں پر اب تم جاؤ''۔

مجھے تیز تیز قدم بڑھانے چاہیے۔ بابا درگاہ کی چوکھٹ پر انتظار کر رہے ہوں گے۔ میں کتاب مکمل کر کے آج ہی اس شہر سے کوچ کر جاؤں گا۔ مجھے تو ابھی بہت سارے گیت، کتھائیں اور کہانیاں اکٹھی کرنی ہیں۔کیا پتہ آخر سفیان کا کیا ہوا ہوگا۔حیا اور بینش کی زندگیوں میں سے کس کی زندگی سنور گئی ہوگی اور.....

میں تجسُس اور اشتیاق کے مارے تیز تیز قدموں سے درگاہ کی اور بڑھنے لگا۔درگاہ کے سامنے آج حاضرین کی کافی بھیڑ اُمڈ آئی ہے۔میں اپنے ساتھ بڑ بڑایا۔ میں بھیڑ میں سے اپنے لیے جگہ بنانے کی کوشش کرتے ہوئے آگے بڑھنے لگا کہ ایک آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

اللہ بابا ملنگی کی مغفرت فرمائے،ابھی ابھی دم توڑ دیا۔میں ٹھٹھک کر رہ گیا اور کاندھے پر لٹکے تھیلے میں ادھوری کتاب کے صفحات نکال کر اُن پر ہاتھ پھیرنے لگا۔میں نے پچھتاوے اورافسردگی کے عالم میں اوپر آکاش کی طرف نظریں اٹھائیں تو دیکھا کھلے نیلے آکاش میں سفید کبوتر اُڑ رہا تھا۔

☆☆☆

سوار

''کیا آپ کہانی سننا پسند کریں گے؟''

''کیا آپ کو کہانی سننے میں دلچسپی ہے؟''

ویسے آپ کو سنتے پڑھتے دیکھ کر لگتا ہے کہ آپ کو کہانیوں میں داستانوں میں دلچسپی ضرور ہے۔

بھلا کیوں نہ ہوگی کہانی ہماری تاریخ ہے' کہانی آج کی بات ہے' کہانی کل کی امید ہے۔

کہانی کل بھی ہمیں رقم کر رہی تھی' کہانی آج بھی ہمیں لکھ رہی ہے اور کہانی کل بھی ہمیں ضبط تحریر میں لائے گی۔

پر

پر جو کہانی میں آپ کو سناؤں گا یا جواب پڑھیں گے اس پر آپ کو حیرت ضرور ہوگی اس پر آپ کو یقین نہیں آئے گا بلکہ آپ پریشان بھی ہو سکتے ہیں۔ ہوسکتا ہے مجھ پر غصہ بھی ہوں... پر... پر آپ کو یقین کرنا ہی ہوگا جی ہاں یقین کرنا ہی ہوگا بالکل اسی طرح جس طرح آپ کرتے آئے ہیں۔ ہر بات پر..... جی ہر بات پر..... بنا دیکھے' بنا جانے' بنا سمجھے.... بنا پرکھے.... ہاں بالکل ویسے ہی۔

تو سنیے

یہ ان دنوں کی بات نہیں جب سیاہ فام لوگ اپنے ایک ساتھی کے قتل ہونے پر سراپا احتجاج تھے اور سڑکوں پر اتر آئے تھے۔ یہ ان دنوں کی بات بھی نہیں جب ایک نظر نہ آنے والے وائرس کی وجہ سے انسانی وجود خطرے میں آ گیا تھا اور یوں لگ رہا تھا کہ شاید انسانی نسل اب دنیا سے ختم ہو جائے گی۔ یہ اس سے ذرا پہلے کی بات ہے۔

جی ہاں اس سے پہلے کی بات ہے پر اتنی بھی پرانی نہیں کہ جب ریل گاڑی ہمارے علاقے میں آئی تھی.... آپ سن رہے ہے نا؟.... یہ اس کے بعد کی بات ہے جب ریل گاڑی ہمارے علاقے میں آئی تو تھی پر لوگوں کے سفر کا حصہ ابھی نہیں بنی تھی۔ مطلب لوگوں نے ابھی اس میں سفر کرنے کو اپنی ترجیحات میں شامل نہیں کیا تھا۔ کہیں آپ یہ تو نہیں سمجھ رہے ہیں کہ میں آپ کو خواہ مخواہ باتوں میں الجھا رہا ہوں.... نہیں بالکل نہیں.... آپ ایسے تمام تر خدشے اور شبہات دور کریں کیونکہ میں جو آپ سے کہہ رہا ہوں یا جو آپ سن رہے ہیں۔ وہ سچ ہے سو فیصدی سچ.... اور یہ پورا سچ جان کر آپ کو حیرت ضرور ہو گی اور آپ کو یقین نہیں آئے گا... پر...

آپ کو یقین کرنا ہی پڑے گا کیونکہ اس کے سوا آپ کے پاس کوئی چارا نہیں۔

ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا یہ بات ان دنوں کی ہے جب میں اکونٹس محکمے میں کام کرتا تھا اور ۵۰ کلومیٹر کی مسافت طے کر کے اپنے دفتر پہنچتا تھا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب شہر میں میری نئی نئی بدلی ہوئی تھی۔ قصبے سے شہر تک کا سفر بھیڑ سے بھری بسوں میں کرنا پڑتا تھا۔ میں وقت پر پہنچنے کی کوشش میں رہتا.... بس بھاگتا دوڑتا رہتا۔ صرف بھاگتا دوڑتا رہتا۔ اپنے قصبے سے شہر تک کا سفر ڈیڑھ گھنٹے کا تھا وہ ڈیڑھ گھنٹہ تھکا دینے والا ڈیڑھ گھنٹہ اُف..... پر بس اڈے اور میرے دفتر کے درمیان راستے میں ایک بات راحت کی تھی۔ وہ تھی شاہی دربار کی عمارت.... اس عمارت پر نظر

جاتے ہی میری ساری تھکان ساری مایوسی دور ہوجاتی۔ ہر ورکنگ ڈے پر آتے جاتے، جب میری نظر شاہی دربار کے ٹیرس پر پڑتی تو مجھے ایک عجیب سا سکون ملتا.... اب آپ پوچھیں گے کہ وہاں شاہی دربار کے ٹیرس پر ایسا کیا تھا؟

شاہی دربار کے ٹیرس پر مجھے وہ نظر آتا..... وہی جو ہر بار مجھے ہنستا مسکراتا دکھائی دیتا..... اور یوں میری تھکان اور اکتاہٹ مٹ جاتی.... ہاں وہی سات منزلہ شاہی دربار کی عمارت جس کی بہت ساری کھڑکیاں ہیں۔ ان ساری کھڑکیوں کو نظر انداز کر کے میں صرف اسے دیکھتا.... اور وہ ہنستا مسکراتا ہوا نظر آتا۔ اس کے ساتھ دوسرا بھی ہوتا... پر میں اس دوسرے کو نہیں بلکہ صرف اسے دیکھتا رہتا...

آپ لوگ سن رہے ہیں نا؟ تو سنیے۔

آپ لوگوں کو یہ پوری کہانی سننی پڑے گی۔ میرا وعدہ ہے کہ کہانی پوری سننے پر آپ کو حیرت ہوگی۔ آپ کا یقین کرنے کو جی نہیں چاہے گا پر آپ کو یقین کرنا ہی پڑے گا کیونکہ آپ کے پاس اس کے سوا کوئی چارا بھی نہیں۔

ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا؟.... ہاں یاد آیا ہر ورکنگ ڈے پر میں اسے دیکھتا وہ ہنستا مسکراتا ہوا نظر آتا۔ اس میں یہ خاصیت ضرور تھی کہ وہ مجھے اپنی طرف روز متوجہ کرتا، میں من ہی من اسے سلام پیش کرتا اور وہ بھی لپک کر میرا سلام قبول کرتا، میرے دل میں اس کے لیے ایک خاص قسم کا جذبہ ایک تقدس و احترام کروٹیں لیتا۔ وہ بھی مجھے اپنی عظمت کا احساس دلاتا رہتا۔

پھر... پھر ایک دن... آپ لوگ سن رہے ہیں نا تو سنیے۔

جی ہاں پھر ایک دن میں جب صبح اٹھا تو بہت کچھ بدل چکا تھا جی ہاں حضرات بہت کچھ بدل چکا تھا۔ بدل جانے کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ میں کسی کیڑے

میں تبدیل ہو چکا تھا۔
نہ میں کیڑے میں تبدیل ہوا تھا اور نا ہی میرے پر نکل آئے تھے' نہ کوئی کایا کلپ ہوا تھا' نا ہی کوئی میٹا مارفوسس ہوا تھا۔ واقعی ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا اور نا ہی کچھ ایسا ہوا کہ میں انسان سے بندر بن گیا میری بات میرے گھر کے افراد سن بھی رہے تھے اور سمجھ بھی رہے تھے پھر بھی بہت کچھ بدل چکا تھا اس بدلاؤ کی وجہ سے کچھ دن گھر میں ہی پڑا رہا۔ صرف میں ہی نہیں' سب گھروں میں ہی پڑے رہے نہ کام دھندا نہ کہیں آنا نہ کہیں جانا۔

پھر ایک سہ پہر....

آپ لوگ سن رہے ہیں نا؟

ہاں تو ایک سہ پہر... کو میں ٹیلی ویژن پر نیوز دیکھ رہا تھا کہ کیا دیکھا شاہی دربار دکھایا جا رہا تھا... پر ''وہ''... ''وہ''... کہیں نہیں تھا۔

صرف اس کے ساتھ جو دوسرا ہوتا فقط وہی نظر آ رہا تھا وہ...؟؟؟ وہ کہیں نہیں تھا۔

''ان ہی لوگوں نے.... ان ہی لوگوں نے.... ان ہی لوگوں نے چھینا ڈوپٹہ میرا''

دھت شیطان کہیں کا' میں نے بچے کو ڈانٹا جس نے ٹیلی ویژن کے رموٹ کا بٹن دبایا تھا اور نیوز کے بدلے فلمی گیت بجا۔

میں نے واپس نیوز چینل رکھا۔ شاہی دربار کے ٹیرس پر ''وہ'' کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے سگریٹ سلگایا اور دوزانوں بیٹھ گیا پریشانی کی حالت میں اپنے تمام جسم کو ہلانے لگا اور سگریٹ کے لمبے لمبے کش لینے لگا۔

پھراس کے بعد ''وہ'' کبھی نہیں دِکھا۔

ہر دن آفس میں کام کرتے کرتے یا پھر گھر باہر، جب بھی جہاں بھی ہوتا میں ہمیشہ اس کے بارے میں سوچتا.... جی ہاں اسی کے بارے میں سوچتا اور پھر سوچتا ہی رہتا۔

ایک دن....

آپ لوگ سن رہے ہیں نا؟ تو سنئے

ایک دن

میں آفس میں کام کرتے کرتے من ہی من اس کے بارے میں سوچنے لگا کہ اچانک مجھے خیال آیا کہ شاہی دربار کے آس پڑوس والوں سے یا پھر شاہی دربار کے سامنے سے گذرنے والوں سے کیوں نہ پوچھا جائے ہوسکتا ہے انہوں نے دیکھا ہو یا پھر انہیں اس کے بارے میں کوئی علمیت ہو کہ آخر ''وہ'' کہاں ہے۔

پھر کیا تھا میں آفس سے بھاگ کھڑا ہوا اور رہ گزر آنے جانے والے سے پوچھنے لگا۔

ارے بھائی... سنو بھائی... دیکھو بیٹا... ارے بہن جی... کیا آپ لوگوں نے اسے دیکھا ہے جب اسے شاہی دربار سے نیچے پھینک دیا گیا تو اس کا کیا ہوا؟ ''وہ'' کہاں گیا؟

کیا کسی نے دیکھا کہ آخر اس کا کیا ہوا؟

سنو تو سہی کوئی بتاؤ تو سہی....

پھر ایسا ہی چلتا رہا جس کسی سے بھی پوچھتا تو کوئی جواب نہ دیتا شاید لوگ اس کے بارے میں بات ہی نہیں کرنا چاہتے تھے یا پھر..........

کچھ مجھ پر ہنستے' کچھ دھکا دیتے' کچھ ڈانٹ پھٹکار پلاتے یا پھر میرا مذاق اڑاتے۔ٹریفک سگنل پر لمبی لمبی قطاروں میں کھڑی گاڑیوں میں بیٹھے لوگوں سے پوچھتا تو وہ اپنی گاڑیوں کے شیشے اوپر کرتے اور مجھے ایسے گھورتے جیسے کوئی عجوبہ دیکھ لیا ہواور کبھی کبھار عورتیں مجھے دیکھ کر باضابطہ چیخ پڑتیں۔ مجھے یاد ہی نہیں کہ کتنے دن' سال 'مہینے بیت گئے'وقت کا دریا بہتا رہا اور بہتا ہی گیا....بس ایسے ہی ....بس یوں ہی....دوپہر کی چلچلاتی ننگی دھوپ ہو'خون جما دینے والی سردی ہو'برف ہو بارش ہو' غرض کوئی بھی موسم ہو ہر موسم میں وہیں اسی سڑک پر ہاں سڑک پر گھومتا رہا مارا مارا پھرتا رہا۔ ہر ایک سے پوچھتا رہا اور اسی تجسس اور تلاش میں رہا کہ کہیں سے کسی طرح تو اس کا پتا چلے۔ کسی کے پاس سے میری پریشانی میرے مسئلے کا حل تو نکل آئے۔

پہلے پہل لوگ میری طرف متوجہ ہوتے تھے.... لیکن بعد میں انہوں نے توجہ دینا چھوڑ دیا۔

ایک دفعہ کچھ لوگوں نے مجھ پر مسلسل نظر بھی رکھی کہ کہیں میں کوئی جاسوس یا مشکوک آدمی تو نہیں ہوں بعد میں انہیں بھی احساس ہوا کہ مجھ پر شبہ کرنا بے کار ہے اور اس طرح میں کال کوٹھری کی ہوا کھانے سے بچ گیا...

پر

پر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا

ایک دن

آپ لوگ سن رہے ہیں نا؟ تو سنئے

ایک دن اچانک کچھ ایسا ہوا جس کا مجھے وہم وگماں بھی نہ تھا

میں سڑک پر ادھر ادھر لوگوں کو پکڑ پکڑ کر پوچھ ہی رہا تھا کہ ''وہ'' کہاں ہے؟

کیا آپ نے اسے دیکھا ہے؟ کہ اچانک ایک بڑی گاڑی کہیں سے آئی اور مجھے کچل کر چلی گئی اور میں نے.... جی ہاں... میں نے... بالکل وہی پر اسی وقت دم توڑ دیا۔

آپ لوگ سن رہے ہیں نا؟

ارے آپ لوگ پریشان کیوں نظر آ رہے ہیں؟

ارے ہاں ایک سوال جو آپ کے دل و دماغ میں کھلبلا رہا ہوگا اور آپ مجھ سے ضرور پوچھنا چاہتے ہوں گے۔شاید وہی آپ کی پریشانی کی وجہ بھی ہے کہ اگر میں واقعی اس دن مر گیا تھا تو میں اس وقت کیسے آپ کو یہ کہانی سنا رہا ہوں.... آخر یہ سب کیسے ممکن ہے؟

ہے نا۔

آپ اسی سوال سے پریشان ہیں نا۔

تو حضرات اس سوال کا جواب ڈھونڈنا آپ کا کام ہے نہ کہ میرا۔

☆☆☆

ماورا

دھند اور کہرے میں گم راہیں اور میں
سڑک کے دونوں اطراف جمی برف کے ڈھیر اور میں
دور تلک خاموشی..... خاموشی ہی خاموشی..... صرف گونجتا سناٹا
اور.....
اور میں
وہ سوچنے لگا
ابھی لوگ گھروں میں ہی ہیں چمنیوں سے دھواں اٹھ رہا ہے
دھواں.....
دھواں میرے دل سے بھی تو اٹھ رہا ہے
پیکٹ میں موجود آخری سگریٹ نے میرے دماغ میں عجیب کھلبلی مچا رکھی ہے کیوں نہ اسے پھونک ڈالوں۔
اس کے دماغ میں خیال کوندا.....
میں اسے پھونک دوں گا....یا.....یا یہ مجھے پھونک دے گی۔
اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیلی۔
اتنی صبح.... میں کیوں نکل آیا ہوں۔ مجھے واپس مڑنا چاہیے پر.... پر....

اچانک اسے خیال آیا..... کمرہ سرد ہے.....ہاں بہت۔اسی لیے تو باہر نکل آیا۔ سرد کمرے کا خیال آتے ہی اس کے رونگھٹے کھڑے ہوگئے۔سرد کمرہ.... سرد کمرہ بالکل میری زندگی جیسا.... ایک دم ٹھنڈا.... میری زندگی ٹھنڈی سہی پر میرے دل میں غم کا الاؤ ہے۔

''تین چیونگم اور تین ٹافیاں لائیں گے''۔راہ چلتے تین بچوں میں سے ایک بچی نے باقی دو کو سمجھایا۔دستانے اور ٹوپیاں پہنے اتنی صبح.....اچھا اچھا پڑھنے جا رہے ہوں گے۔اس نے اپنے سوال کا خود ہی جواب دیا۔

یہ بھی دلچسپ بات ہے ۔ حال سو رہا ہے ....اور .... مستقبل جاگ رہا ہے۔خالی پیٹ سگریٹ کچھ الگ مزہ دیتی ہے۔بچے بھی آگے چل کر راہ مڑ گئے وہ وہاں سڑک کے ساتھ والی گلی سے چلے گئے.....اب صرف راستہ ہے' دھند ہے' اور..... اور میں ہوں۔برف کی چادر سے ڈھکا ہوا یہ وسیع قبرستان کسی بڑے میدان جیسا لگ رہا ہے۔

وہ.....وہ.....وہ قبر ہے....وہ بڑبڑایا اور اپنے باپ کی قبر کے قریب بیٹھ گیا۔اسے وہ سانحہ یاد آیا اور بے حد اداس ہوگیا۔

غسال نے کہا۔

''اس میت کے کپڑے نکالتے وقت اس کی جیب سے تیس روپے نکلے ''صرف تیس روپے''.....

لاکھوں کروڑوں کے خواب دیکھنے والے کی جیب سے صرف تیس روپے.... خود چلا گیا' آگے نکل گیا۔پیچھے پیچھے اگر چھوڑ گیا تو.... کچھ قرضہ' کچھ ذمہ داریاں.....

نہ کوئی جائیداد' نہ زمین نہ مکان....؟ کچھ بھی نہیں.... کچھ بھی نہیں اور

اپنے ساتھ لے گیا.... اپنی ساری جمع پونجی.... کئی خواب.... کئی ارمان....

یہ سراسر ناانصافی ہے.... وہ اپنے ساتھ بڑبڑایا۔

اس نے ایک لمبی آہ بھری۔

یہیں.... وہ.... وہاں.... میرے دوست کی قبر ہے۔

اس نے گردن گھما کر دیکھا۔ وہ وہاں سو رہا ہے۔

ساتھ کھیلے، ساتھ جوان ہوئے اور پھر ساتھ جوانی کے مزے بھی لوٹے پر ایک دن.... چلتے چلتے وہ تھک کے بیٹھ گیا.... بیٹھ گیا اور سو گیا۔

کیوں اور کیسے!.... پتا نہیں ۔بس شاید بہت جلدی تھک گیا یا پھر ہار گیا۔

اس نے پھر ایک لمبی آہ بھری۔

اس نے سڑک کی طرف دیکھا۔

اب کچھ کچھ لوگ گھروں سے نکل آئے ہیں۔ اِکا دُکا گاڑیاں بھی چلنے لگی ہیں۔ وہ اٹھا اور چل پڑا۔

واپس جاؤں.... پر.... پر کمرہ سرد ہوگا....

اسے پھر خیال آیا۔

اس یخ بستہ صبح شہر کی سڑکوں پر اب دھیرے دھیرے تھوڑی سی چہل پہل شروع ہونے لگی ہے۔

مجھے کچھ عجیب سا محسوس ہو رہا ہے.... ہاں شاید بھو.... بھوک لگی ہے۔

ہاں مجھے بھوک لگی ہے۔

کچھ کھا لیتا ہوں۔

جیب میں صرف ایک پانچ روپے کا سکہ ہے۔اس نے کوٹ کی جیبیں ٹٹولیں۔

پانچ روپے؟

ان پانچ روپیوں سے کیا ہوسکتا ہے؟

کیا ہوسکتا ہے بھلا؟

تھوڑی دیر کچھ سوچنے کے بعد۔

کیوں کچھ نہیں ہوسکتا! بہت کچھ بہت کچھ ہوسکتا ہے....

اس نے اپنے سوال کا خود ہی جواب دیا۔

بلکہ کیا کچھ نہیں ہوسکتا ہے۔

ایک سستی سی سگریٹ یا ایک قہوے کی پیالی یا پھر چنے....چنّے بھی تو کھائے جاسکتے ہیں۔ پھٹے پرانے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ٹھوسے گلے میں سرخ رنگ کا مفلر ڈالے وہ چلتے چلتے سوچ رہا تھا۔پانچ روپے میں بھی بہت کچھ آسکتا ہے۔وہ بنا شیو کیے ہوئے چہرے جس پر کچھ کچھ داڑھی اُگ آئی تھی کو کھجانے لگا۔

پھر یہ خیال آتے ہی دل میں مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی کہ کوٹ کی اوپری جیب میں میرا کل سرمایا' میری زندگی کی کل اثاث یا جاگیر ہے۔

اینا کی تصویر

ذرا نکال کر دیکھتا ہوں۔اس نے تھوڑی خوشی' ذرا سی راحت محسوس کی اور ....اور پھر خود کے ساتھ بڑبڑانے لگا۔

دن میں سو بار تو دیکھتا ہوں یہ بلیک اینڈ وایٹ تصویر

میں بھی کتنا....

اس نے تصویر نکالی اور اسے دیکھ کر ہی مخاطب ہوا۔

کیسی ہو اینا؟

ویسی کی ویسی.... بالکل وہی خوبصورتی، وہی معصومیت.... واہ.... ارے اب بھی مسکرا رہی ہو۔

میں تمہارے غم میں در بدر مارا مارا پھر رہا ہوں اور تم.... اس کے لبوں پر پھر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

شاید میں اپنی زندگی کی تمام ناکامیاں، تلخیاں بھول جاتا اگر مجھے تم.... تم مل جاتی مگر.... میری قسمت میں یہ بھی نہیں تھا۔

اینا!

اینا میں تمہیں بہت یاد کرتا ہوں۔ ہر پل، ہر گھڑی.... کیا.... کیا میں بھی تمہیں یاد آتا ہوں کبھی؟

تمہاری یاد جب آتی ہے تو یوں لگتا ہے کہ اندر ہی اندر بہت کچھ مسمار ہو رہا ہے۔ بہت توڑ پھوڑ مچتی ہے.... اور یہ سوال ہمیشہ پریشان کرتا ہے۔

جب ہمیں زندگی ساتھ گزارنی ہی نہیں تھی تو پھر ہم ملے ہی کیوں تھے؟ میں تمہارا دیوانہ.... دیکھو زندگی تباہ کر بیٹھا، میں کچھ کہہ رہا ہوں تم سے اینا....

اینا!.... اور.... اور تم مسکرا رہی ہو۔

جانتی ہو اینا؟ میری جیب میں صرف.... پانچ روپے ہیں۔ صرف پانچ روپے.... کیا کروں میں.... کیسے کاٹوں گا دن زندگی کے۔

مجھ جیسے کو نہ کوئی نوکر رکھے نہ کوئی کام کرائے، صحت وطبیعت ایسی کہ مزدوری تو دور کی بات کوئی بیگار بھی نہ لے....

وہ مایوس سوچنے لگا۔

سب قسمت کا چکر ہے۔

والد کی کسمپرسی، دوست کا جوانی میں مرجانا یا پھر میرا یوں چھوٹی چھوٹی خوشیوں کے لیے ترسنا.....

سب قسمت کا کھیل ہے۔ سچ میں سب قسمت کا ہی تو کھیل ہے یا پھر کچھ اور ہے....؟

آہ!

مجھے بہت بھوک لگی ہے.... بھو.... بھوک.... صرف....... پانچ روپے ہیں....

ارے ہاں آج تو اخبار میں میری لکھی ہوئی کہانی بھی چھپی ہوگی۔ کیوں نہ اخبار خریدوں۔ کم سے کم خوشی کا کوئی پل تو نصیب ہو۔ اپنی کہانی چھپی دیکھ کر یقیناً مسرت ہوگی۔

..... پر بھوک کا کیا کروں؟ اگر اخبار خریدا تو کھاؤں گا کیا؟

پھر میں اخبار کیوں خریدوں بھلا؟

خبروں سے مجھے دلچسپی نہیں، اپنی لکھی کہانی مجھے پڑھنی ہی نہیں۔ ویسے بھی میں نے ہی تو لکھی ہے۔ پڑھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اوروں کا لکھا ہوا میں پڑھتا ہی نہیں۔ تو کیوں، کیوں خریدوں میں اخبار؟

ویسے بھی جس دن میں کسی اور کا پڑھوں گا.... اس دن میرے اندر کے کہانی کار کی موت واقعہ ہوگی۔

قہوے خانے سے لوگ نکل رہے ہیں اور میری بھوک بہت بڑھ چکی ہے۔

میں نے رات کا کھانا بھی تو نہیں کھایا تھا۔

ایک بار پھر تسلی کرتا ہوں ہاں.... ہاں.... برابر ہیں۔

دروازے سے ذرا سا دو قدم کے فاصلے پر ایک بوڑھی عورت چادر سے منہ چھپائے بھیک مانگ رہی ہے۔

''دے دو بیٹا کچھ پیسے دے دو بیٹا''۔

میں نے پہلے منہ بنایا اور کچھ کچھ جھنجھلاتے ہوئے اس بوڑھی عورت سے نظریں چراتا ہوا اندر داخل ہوا۔

دروازے پر سے موٹی کمبل ہٹاتے ہی دیکھا اندر بہت بھیڑ ہے۔لوگ سگریٹ پھونک رہے ہیں' قہوہ پی رہے ہیں۔پیالیوں کے ٹکرانے کی آوازیں.... درمیان میں ایک بڑی سی انگیٹھی سلگ رہی ہے۔

انگیٹھی کے اندر بڑے بڑے شعلے ہیں.... شعلے..... پر میرے اندر جو شعلے ہیں ان سے تھوڑے کم ہی ہیں۔میرے دل میں بھی بڑے بڑے شعلے ہیں۔

کیوں نہ ایک کونے میں دبک کر بیٹھ جاؤں۔ویسے بھی مجھے کون جانتا ہے یہاں؟ کون پہچانتا ہے؟ اسی شہر کا ہو کے بھی' میں کسی سے واقف نہیں نہ کوئی میرا شناسا ہے۔

وہ اُس.... وہ اُس.... ٹیبل.... تھوڑی سی جگہ ہے وہیں بیٹھتا ہوں۔ تصویر نکال کر دیکھتا ہوں۔ پتا نہیں میں بھیڑ سے کیوں اتنا گھبراتا ہوں اور جب بھی گھبراتا ہوں تو فقط ایک ہی شے ہے جو مجھے حوصلہ دیتی ہے۔

اینا.... اینا کی تصویر

وہ سب کی نظروں سے خود کو بچاتا ہوا اینا کی تصویر دیکھنے لگا۔

میرے ہونٹ کیوں خشک ہورہے ہیں؟ سردی بھی بہت ہے۔کپکپی سی لگ رہی ہے۔گرم قہوے کی خوشبو میرے نتھنوں سے ہوتے ہوئے معدے میں سرائیت کررہی ہےاور یوں میری بھوک اور بڑھ رہی ہے۔

''ارے سنو''

ایک....ایک....ایک پیالہ قہوہ....

''ٹھہرو''

اس نے ایک اونچی آواز لگائی اور تھوڑی ہی دیر میں گرم قہوہ....اس کی نظروں کے سامنے....

وہ بوڑھی عورت....پتانہیں کیوں اور کن حالات سے مجبور ہوکر....

وہ انگیٹھی میں جل رہے شعلوں کو گھورنے لگا اور سوچنے لگا۔ایک بے ترتیب اور بے ربط سوچ اسے دھیرے دھیرے گرفت میں لینے لگی۔

بھو.... بھوک....بوڑھی عورت....انگیٹھی میں شعلے....یہ شعلے میرے اندر.... میرے اندر بھی سلگ رہے ہیں.... سرد کمرہ.... گرمی....انگیٹھی....میں کتنا کم ظرف ہوں۔

پر....پر میں کیا کرسکتا ہوں۔میرے ہاتھ میں کیا ہے؟

یا میرے بس میں کیا ہے؟

کچھ نہیں.... کچھ بھی تو نہیں۔میری جیب کیوں خالی ہے؟ میں کیوں بھوکا ہوں؟ میں کیوں مصیبت جھیل رہا ہوں؟....میں نے کسی کا کیا بگاڑا ہے....میں ہی کیوں....میری کیا غلطی ہے؟

یا پھر....یا پھر....اس بوڑھی عورت کی کیا غلطی ہے؟

آخر سب کس کی غلطی ہے؟

کس کا قصور ہے؟

بھوک.... سرد کمرہ.... گرم شعلے.... انگیٹھی.... پانچ روپے.... باپ کی کسمپرسی.... جواں مرگ دوست....

اس بوڑھی عورت نے پتا نہیں کچھ کھایا بھی ہوگا یا نہیں.... عورت نہیں.... عورت نہیں بلکہ اماں کہنا چاہیے.... بھو.... بھوک.... اُف یہ مفلسی.... اور یہ لوگ.... قہوے خانے میں بیٹھے بے فکرے لوگ۔ گپ شپ، ہنسی مذاق میں ڈوبے لوگ، ٹھاٹھیں مار رہے لوگ.... کسی کو کسی کی پرواہ نہیں، کوئی فکر نہیں.... کوئی خبر نہیں.... جب ان سب کو میری پرواہ نہیں.... میری فکر نہیں.... میری خبر نہیں.... مجھے کیوں.... مجھے کیوں پھر ہر وقت ان کا دھیان پریشان کرے، ان کا خیال ستائے؟ سچائی کتنی کڑوی ہے اور سچ یہی ہے.... جو کچھ میں یا وہ بوڑھی اماں بھگت رہے ہیں، جو کچھ ہم سہہ رہے ہیں، جو کچھ ہم جھیل رہے ہیں۔ یہی سب سچ ہے.... ہاں یہی سب سچ ہے باقی سب بکواس ہے.... ڈھکوسلہ ہے.... ڈھونگ ہے.... اسی لیے.... اسی لیے.... مجھے انکار ہے!

مجھے انکار ہے اس سماج سے، ان رسموں سے.... ، رواجوں سے.... ، کل سے.... ، آج سے.... ، علم سے.... ، قلم سے.... ، یہاں تک کہ خود سے، اور.... دوسرے ہی لمحے.... وہ نم آنکھیں لیے سڑک پار کر رہا تھا۔ پر مطمئن ضرور تھا کیونکہ وہ قہوے کا پیالہ دیوار پر پھینک آیا تھا اور پانچ روپے کا سکہ بوڑھی اماں کی جھولی میں۔

☆☆☆

عشق صحرانوردی

میرے بس میں ہوتا تو میں اس کا خون کر دیتا۔

کافی دیر سے میرا بیجا کھا رہا ہے پر کیا کروں مجبوری انسان سے کیا کچھ نہیں کرواتی۔ مجھے بھی جینے کی خواہش نے اس کی بکواس سننے پر مجبور کر دیا۔ اس کے سوا کوئی چارا بھی تو نہیں۔ بس یہی ایک ناؤ' یہی ایک ناو ہے جس نے مجھے بچا لیا ورنہ جنگلوں اور پربتوں کی خاک چھاننے کے بعد کوئی امید نہیں تھی کہ میں بچ پاؤں گا سب ختم ہوتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ سب کچھ.... سب.... یہاں تک کہ زندگی بھی.... زادِ سفر ختم ہوتے ہی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا تاحدِ نظر بس دشت ہی دشت....

پھر جب اس دریا کے کنارے پہنچا تو آگے جانے کے لیے کوئی بھی سہارا دکھائی نہیں دیا ایک دم سے لگا اب کی دفعہ میری آوارگی مجھے مہنگی پڑ ہی گئی پر کچھ دیر اضطراب اور پریشانی میں رہنے کے بعد جب یہ ناؤ آتی دکھائی دی' تو میری جان میں جان آ گئی۔ پر.... مجھے کیا پتا تھا یہ ناؤ چلانے والا کوئی مسیحا نہیں بلکہ ایک پاگل ہوگا۔

یہ ناؤ چلانے والا عجیب عجیب طرح کی باتیں کرتا' کبھی منہ بناتا تو کبھی بے وجہ ہی ہنس دیتا اور کبھی اچانک مجھے اپنی باتوں سے ڈرا دیتا.... عجیب وغریب'

پُر اسرار شخص.... اب تو یوں لگتا ہے اس کو سمجھنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ دو باتیں اس میں اور مجھ میں مشترک ہیں۔

ایک عشق

دوسرا تیرا کی نہ آنا

عشق مجھے اپنی آوارگی سے اور اسے اپنی محبوبہ سے تھا اور تیرنا مجھے بھی نہیں آتا اور بقول اس کے.... اسے بھی نہیں آتا۔

سچ کہا ہے کسی نے جسے تیرنا نہ آئے وہ جاہل ہے۔

اس کی بے تکی باتوں نے مجھے پریشان کر رکھا ہے اور یہ لو اب اسے اپنی محبت کی داستان بھی سنانی ہے اور میں بھی مجبور.... میں نے سننے کی حامی بھر لی۔ مرتا کیا نہ کرتا۔

میں من ہی من یہی سب سوچ رہا تھا وہ کہنے لگا

''سنتے ہو مسافر' بے منزل' بے سمت مسافر' زندگی کو آوارہ گردی سمجھنے والے نادان اجنبی''۔

''سن رہے ہونا''

''تو سنو''

''دھیان سے سنو''

''میری عرشی دنیا کی سب سے خوب صورت اور ذہین لڑکی تھی''۔

''تھی.... مطلب!''

''سوال نہیں بس.... سنتے رہو''

''وہ نیک سیرت' نیک بخت....'' اس نے سوچنے والے انداز میں کہا۔

''آ کاش نے نیلا ہٹ اس کی نیلی آنکھوں سے لی ہے۔ یہ دن کو روشنی اس کے چہرے سے ملی ہے''۔

''بے حد حسین و جمیل بے حد پُر کشش اور اس پر بھلا کی ذہین بھی۔ دوسرے کے غم سے پگھلنے والی' دوسروں کا درد سمجھنے والی.... حد سے زیادہ حساس۔''

''سن رہے ہو نا؟'' اس نے میری طرف جانچنے والی نظروں سے دیکھا۔ پھر اطمینان کی سانس لیتے ہوئے۔ گویا ہوا

''شاباش سنتے جاؤ''

''پر ایک لت لگ گئی تھی اس کو'

جو اسے کمسنی میں ہی لگ گئی تھی'

''لت.... وہ کیا؟''

میں نے سفر کاٹنے کے لیے بات بڑھانا چاہی۔

''بیچ میں مت ٹوکو' اس نے تنبیہ کی۔

''ہاں تو میں کہہ رہا تھا ایک لت لگ گئی تھی اس کو'

''کتابیں پڑھنے کی لت.....''

''ہر طرح کی' ہر قسم کی کتابیں'

''ہر وقت' ہر لمحہ''

''کتابیں کتابیں بس کتابیں'

''مذہب' ادب روحانیت فلسفہ اور نہ جانے کیا کیا'

میں اسے اکثر کہتا

''کیوں اس بند کمرے میں بیٹھی ہو؟'' باہر نکل کر تو دیکھو دنیا جہاں کو' موسموں کو' بدلتی رتوں کو' دن کو' رات کو' سورج کو' چاند کو.... پر.... پر.... وہ بند کمرے میں کھڑکیوں پر پردے ڈالے بس پڑھتی رہتی اور کہیں کھو جاتی''۔

ایک دن میں نے کہا۔

''عرشی پتا ہے بہار آئی ہے ہر سو خوب صورت نظارے ہیں۔ پھول' پتیاں اور آبشار اپنے جوبن پر ہیں۔ چلو اٹھو گھوم پھر لیتے ہیں''۔

وہ مسکرائی اور بولی۔

''میں جو پڑھ رہی ہوں' اس میں بھی یہی سب ہے۔ میرا مطلب ہے بہار ہی بہار ہے اس میں۔ تمہیں پتا ہے اس کتاب کا نام ہی ہے.... کتابِ بہار''

وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی جیسے ان نظاروں کو اپنے اندر جذب کر رہی ہو۔

اور ایک دن

''عرشی''

''ہوں''

''سن رہی ہو؟''

''ہاں سن رہی ہوں''

''تم بہت خوب صورت ہو'' میں نے لگاوٹ سے کہا۔

''پتا ہے''

''تم سن رہی ہو یا نہیں''

''ہاں بابا سن رہی ہوں بس یہ کتاب پڑھ کر ختم کر لوں۔ پھر بات کریں گے''۔

''کون سی کتاب ہے یہ؟''

''اس کا نام ہے....''

''کتابِ دنیا''

''بس پڑھتی رہو، بس پڑھتی ہی رہو یہ نہیں کہ کبھی میرے دل کی بات بھی سن لو'' میں نے کچھ جھنجھلا کر کچھ ناراض ہوتے ہوئے کہا۔

جانتی ہوں، سب جانتی ہوں میرے محبوب.... اس نے میری آنکھوں میں دیکھ کر مسکراتے ہوئے بات جاری رکھی.... جانتی ہوں کہ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں''۔

میں نے اپنا موڈ ٹھیک کرنے کی کوشش کی اور عرشی سے پوچھا۔

''اچھا تم اتنا کیوں پڑھتی ہو؟''

''بس مجھے اچھا لگتا ہے'' وہ ہنس دی سچ مانو مجھے یوں لگا جیسے ساری کائنات مسکرا رہی ہو۔

''پھر بھی بتاؤ تو سہی اتنا کیوں پڑھتی ہو؟'' میں نے ضد کی۔

''اگر کہوں گی تو کیا تم سمجھ جاؤ گے؟'' اس نے دلچسپی سے پوچھا۔

''کوشش تو کر سکتا ہوں''۔ میں نے اندر کے اضطراب پر قابو پاتے ہوئے سادگی سے کہا۔

''اگر نہیں بھی سمجھا تو بتا دوں گا''۔

''میں جاننا چاہتی ہوں''۔

''کسے؟'' اب میرا اضطراب میرے لہجے میں در آیا۔

''اس خدا کو جس نے ہمیں بنایا، جس نے یہ ساری کائنات بنائی۔ میں صرف اسے ہی نہیں.... بلکہ وہ سب جاننا چاہتی ہوں، وہ سب... جو ہمارے ساتھ

ساتھ چلتے ہیں... وہ ... جو ہمارے ساتھ ہوتا ہے۔زندگی‘موت‘ یہ کائنات‘ یہ سارا جہاں‘ خوشی‘غم‘سب کچھ‘سب کچھ جس کا ہم شکار ہوتے ہیں۔سب کچھ جو ہم سب پرگزرتی ہے۔‘‘وہ ترنگ میں بول رہی تھی اور میں مبہوت اسے دیکھ رہاتھا...‘‘

تھوڑا توقف کے بعد

’’اور یہ بھی جاننا چاہتی ہوں کہ یہ سب کیا ہے؟....یہ سب کیا ہے؟ان کا مرکز کیا ہے؟...ہمارا وجود کیا ہے؟‘‘

’’تمہیں پتہ ہے یہ سب ایک سربستہ راز ہے‘ایک ایسا معمّہ‘ایک ایسا سوال ہے‘جس کا جواب....

’’اس معمّہ کا کوئی حل‘اس سوال کا کوئی تو جواب ہوگا؟

’’اور مجھے اس جواب کی تلاش ہے‘‘۔

سچ پوچھو تو میں کچھ سمجھ ہی نہ پایا وہ کیا کہنا چاہتی تھی پر میں نے اسے محسوس نہ ہونے دیا۔میں مسکرایا اور کہا۔

’’میں چلتا ہوں آج کام پر جانے میں خاصی دیر ہوگئی۔پھر کبھی ضرور سنوں گا تمہاری باتیں اور تمہاری تلاش کے بارے میں....ہا...ہا...ہا...ہا‘‘۔

ایک دن دیکھا عرشی بہت اداس تھی حسب عادت کتاب میں کھوئی ہوئی۔

’’کیا پڑھ رہی ہو عرشی؟‘‘’’یہ کتابِ خزاں ہے‘‘۔

’’تم تو مرجھا سی گئی ہو‘‘۔

’’نہیں میں ٹھیک ہوں‘‘۔

’’اپنا خیال رکھا کرو‘یہ دیکھو تم نے بالوں میں کنگھی بھی نہیں کی ہے آؤ میں

تمہارے بال بناؤں''۔

''کہاں پہنچی تمہاری تلاش....؟'' چوٹی بناتے ہوئے میں نے پوچھا۔

''ابھی کچھ ہاتھ نہ لگا پر مجھے امید ہے میں وہ سراغ پالوں گی۔جس کی مجھے جستجو ہے''۔

''پر یاد رکھو'' میں نے کہا۔

''ہمیں ہمیشہ کے لیے ایک ہونا ہے سمجھ رہی ہو نا؟'' اس کے ہونٹوں پر شرمگین مسکراہٹ پھیل گئی۔

پھر ایک دن دیکھا وہ بستر پکڑ کر بیٹھ گئی ہے۔وہ....بستر....وہ بستر جو پھر اس نے کبھی نہیں چھوڑا۔

''کیا ہوا؟'' میں پاگلوں کی طرح چلایا

''میں ٹھیک ہوں بس تھوڑی سی کمزوری ہے''۔

میں نے دیکھا اس کی آنکھوں کے نیچے سیاہ گھڑے پڑ گئے تھے اور وہ واقعی بہت کمزور لگ رہی تھی پر وہ اس وقت بھی پڑھ رہی تھی۔

''یہ کون سی کتاب ہے عرشی؟'' میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے پوچھا

''یہ کتابِ زیست ہے''۔

عرشی کی حالت دیکھ کر میں کچھ سمجھا نہیں پر پریشان ضرور ہوا۔

کچھ دنوں بعد

میں اس کے سرہانے آنسو بہار ہا تھا اور وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں بستر پر پڑی ہوئی تھی۔کیا ڈاکٹر' کیا حکیم یا فقیر... مرض نا قابل تشخیص تھا اچانک اس کے لب ہلے اور مجھے اپنے قریب بلایا۔میں گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور اس کی طرف جھک

کر میں نے اپنا دایاں کان اس کے کانپتے لبوں کے قریب کیا۔

''تم... تمہیں.... تمہیں پتا ہے میرے محبوب.... میرے محسن''۔

م... م.... مجھے اس معمّہ کا حل، اس سوال کا جواب بالآخر مل ہی گیا وہ بات.... وہ بات.... وہ''اصل بات... جو ان سب کا مرکز بھی ہے اور سبب بھی۔ مجھے وہ بات پتا چل ہی گئی ہے آؤ... آج تمہیں بتاتی ہوں، میرے قریب آؤ اور .... قریب آؤ.... ''میں تھوڑا مزید جھک گیا وہ کہہ رہی تھی۔

''... پر اس وعدے کے ساتھ کہ تم یہ بات کسی سے نہیں، کسی سے نہیں کہو گے۔ کسی... کسی سے نہیں کہو گے''اس کی سانسیں اکھڑ رہیں تھیں مگر آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی... وہ کہہ رہی تھی۔

''بات بہت اہم ہے۔ ان سب سوالوں کا جواب... جواب... سن رہے ہو نا....؟''

''ہاں... ہاں عرشی بولو میں سن رہا ہوں''۔

وہ پتوار چلاتے چلاتے رُک گیا۔

میری حیرت کے مارے آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

''ہاں بتاؤ... ہاں بتاؤ تمہاری محبوبہ نے تمہارے کان میں کیا کہا؟''

میں تجسس و اضطراب کے مارے بھڑک اٹھا۔ میں خود جس بات کے لیے ترس رہا تھا برسوں سے جنگل اور دشت و بیاباں میں بھوکا پیاسا بھٹکتا پھر رہا تھا ... وہ... وہ... بات... وہ جواب....

''ہاں ہاں بتاؤ۔ کیا کہا اس نے تمہارے کان میں کیا کہا''میں نے اضطراری حالت میں پوچھا۔

وہ میری طرف دیکھ کر اطمینان سے مسکرایا...اچانک میری دھڑکنیں تیز ہوگئیں، پھر... پھر میں کچھ سمجھ ہی نہ پایا۔

''وہ....؟''

بس پانی میں سے چھپاک کی آواز سنائی دی....اور دریا کے پانی میں دائرے بن رہے تھے۔

☆☆☆

Kaghazi Lashkar Ka Sipahi

A Collection of Short Stories

by : Nasir Zameer

